ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

نومبر ۱۹۹۱ء

اِس شمارے کے ساتھ
ایک خوبصورت اسٹیکر
مُفت
حاصل کیجئے

سیاچین کیسے فتح ہوا؟
لمحہ لمحہ کی رُوداد اس شمارے میں پڑھیے

وہ کانچ کھاتا اور تیزاب پیتا ہے، پھر بھی جیتا ہے
مگر کیسے؟

چاند پر تتلیاں رہتی ہیں
حیرت انگیز انکشافات

پاکستان کا یومِ آزادی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء بروز جمعۃ المبارک نہیں ہے
نئی تحقیق

SGNL-1-91-C LASER DOT

R-LINTAS

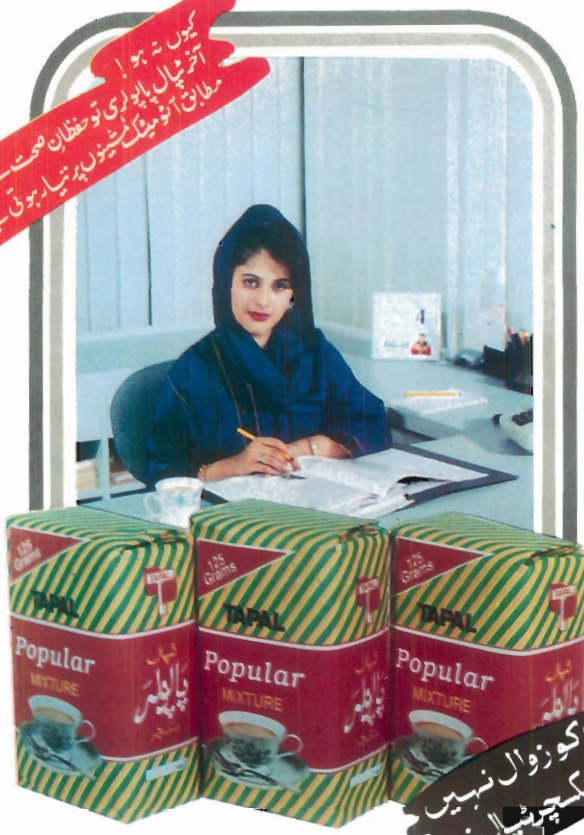

اَب آیا نا سافٹ پیک چائے کا اصل مزہ!
کیوں نہ ہو! آخر ٹپال پاپولری تو حفظانِ صحت کے عین مطابق آٹومیٹک مشینوں پر تیار ہوتی ہے۔
125 Grams
TAPAL
Popular
MIXTURE
ٹپال پاپولر
سچ کو زوال نہیں
ہر کینیا مکسچر ٹپال نہیں
ہمیشہ اچھی چائے ٹپال ہی بنائے
چائے میں ٹپال کے سالہا سال تجربے کا رنگ اور مہارت کا مزہ
IBLAGH
Golden

سرکہ اور سلاد
تن دُرست۔ دل شاد

خالص سرکہ کا استعمال ماہرینِ طب کے مُطابق بہت سے امراض کا علاج بھی ہے اور ان سے بچاؤ کی تدبیر بھی۔ خاص طور پر گرمی اور برسات کے موسم میں خالص سرکہ کا استعمال نہایت ضروری ہے۔

احمد فروٹ وِنیگر خالص سرکہ ہے جو پھلوں سے تیار کیا جاتا ہے اور عام بازاری سرکہ کے مقابلے میں صحت کے لئے زیادہ فائدہ مند ہے۔

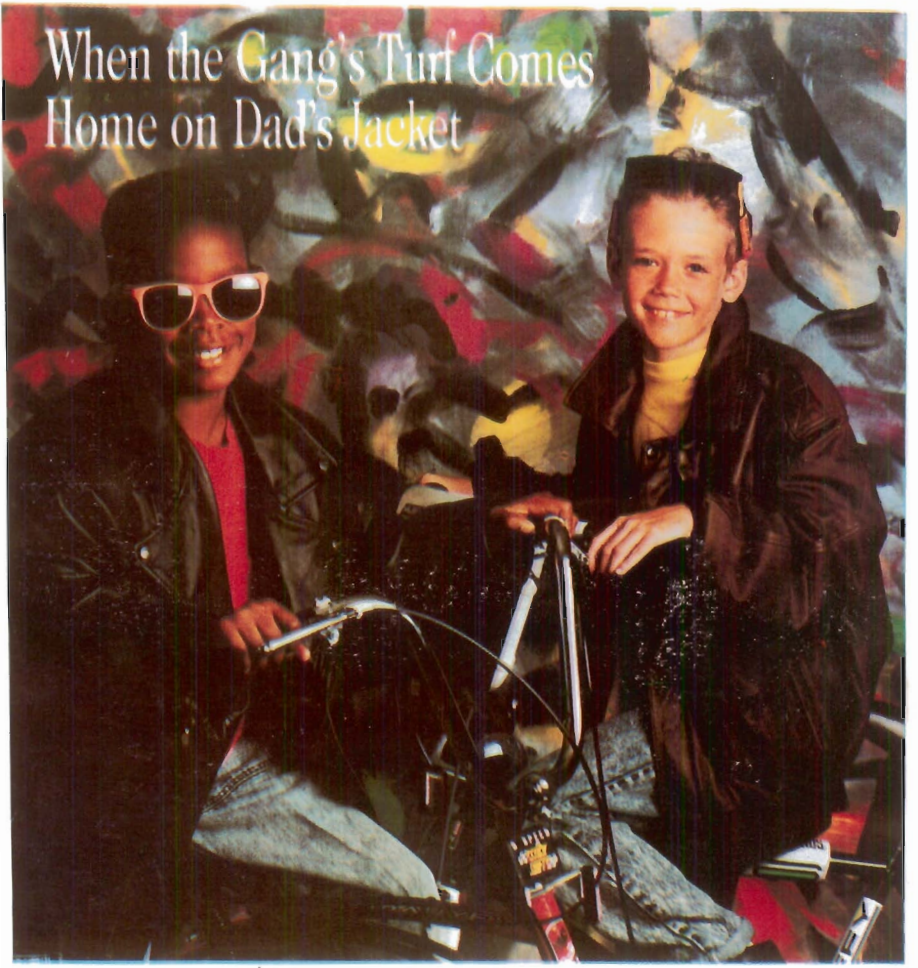

Trust Your Leather to Your Drycleaner

Snowhite
DRY CLEANING INDUSTRIES
Karachi Multan Lahore Rawalpindi

Head office:Snowhite Centre, Abdullah Haroon Road, Karachi. Phones: 511711-515904-515083- 514018 Fax: 513935

Branches: Bahadurabad, Tel: 413695 ● Burns Road, Tel: 213336 ● Clifton, Tel: 573298 ● Defence, Tel:577834 ● Gurumandar, Tel: 410521 ● Garden, Tel: 7722433 ● Kharadar, Tel: 204175 ● Shahrah - e - Faisal, 446682 ● M.T Khan Road, Tel: 551370 ● Carpet Cleaning Div. , Tel: 515904 ● Multan, Tel: 72780 ● Lahore, Tel: 874933 ● Rawalpindi, Tel: 567988

کوئی ایسا تحفہ لائے
جو دل میں پھول کھلائے

احمد

بہترین حلوہ ٹین

سوہن حلوہ - حبشی حلوہ - کراچی حلوہ

احمد فوڈ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی-۱۱۳، نورس روڈ، سائیٹ، کراچی

نیا سال نیا خاص نمبر

آنکھ مچولی کا آئندہ خصوصی شمارہ

عالمی ادب نمبر

جنوری ۱۹۹۲ء میں شائع ہو رہا ہے

- دیس دیس کی کہانیاں۔
- نگر نگر کے قصّے۔
- دُنیا بھر کے ادب سے بہترین انتخاب۔

آپ بھی لکھئے اور اپنے حُسنِ انتخاب کی داد پائیے

- ہر قابلِ اشاعت تحریر پر ۱۰۰ روپے سے ۵۰۰ روپے تک کا معاوضہ۔
- ہر وہ تحریر زیادہ معاوضے کے قابل سمجھی جائے گی جس کا تعلق غیر معروف دُنیائے اَدب سے ہو۔
- ہر ترجمے کے لیے اصل تحریر کا حوالہ ضروری ہوگا۔

خصوصی بچت اسکیم

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے
کتنے سستے کتنے پیارے

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۔
۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی
رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف ۱۵۰ روپے ۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

۵۰ روپے کی
خصوصی رعایت اور
تحفہ مفت

آنکھ مچولی بیرون ملک منگوانے کے لئے زر سالانہ مبلغ ۲۰/- روپے ۔
زر سالانہ کی رقم دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوادیں

ماھنامہ
آنکھ مچولی
۱۱۲- ڈی، نورس روڈ
سائٹ، کراچی

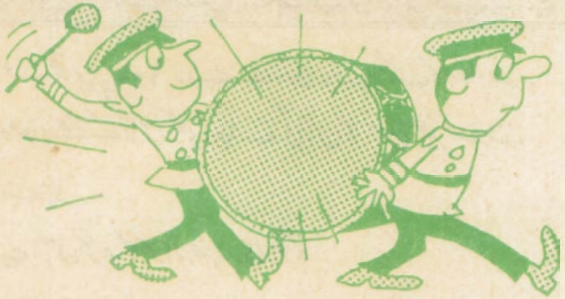

The First name in Bicycles, brings ANOTHER FIRST

SOHRAB
VIP
sports

Sohrab the leading national bicycle makers now introduce the last word in style, in elegance, in comfort, absolutely the last word in bicycles.

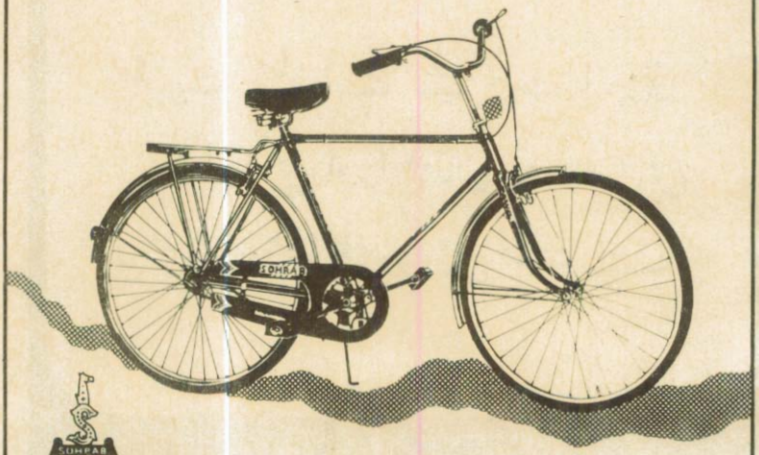

SOHRAB
KICS. LTD

PAKISTAN CYCLE INDUSTRIAL COOPERATIVE SOCIETY LIMITED
National House, 47 Shahrah-e-Quaid-e-Azam Lahore Pakistan.

Midas

آدابِ سفر

سفر وسیلہ ظفر ہے

اسے زحمت نہ بنائیے

سفر سے پہلے اپنے لیے سیٹ یا برتھ
ریزرو کروائیں اور اطمینان سے سفر کریں
یہ سہولت بیشتر گاڑیوں میں موجود ہے۔

براہ کرم پاکستان ریلوے سے تعاون کیجئے

محکمہ تعلقات عامہ

نئی نسل کے ادب کا
بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

مسلسل دوسری بار اعلیٰ معیار کا ایوارڈ حاصل کرنے والا
پاکستان کا واحد ماہنامہ

مدیرِ اعلیٰ	ظفر محمود شیخ
مدیرِ مسئول	تجمل حسین چشتی
مشاورت	مشفق خواجہ امجد اسلام امجد
مدیرانِ اعزازی	طاہر مسعود محمد سلیم مغل
مجلسِ ادارت	ساجد سعید منیر احمد راشد
اشتہارات	محمد عرفان
نمائندہ امریکہ	عبدالرشید خان

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت

ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔

ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمّہ دار نہ ہوگا۔

ماہ نامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچّوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۵، نومبر ۱۹۹۱ء ربیع الثانی / جمادی الاوّل ۱۴۱۲ھ فون نمبر ۲۹۹۱۷۸

قیمت
۱۰ روپے ۷ ریال ۷ درہم

ناشر: ظفر محمود شیخ، طابع: زاہد علی، مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ، کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہ نامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ ڈی نورس روڈ سائٹ کراچی

تاریخ کے دریچے سے ادارہ ۱۴
پہلی بات ظفر محمود شیخ ۱۵
ہمارا پیارا خدا (نظم) ضیاء اسلام پوری ۱۷
بہ خدمت جناب خطوں کے جواب ۱۹
انسانِ کامل محمد یوسف اصلاحی ۲۴
شہیدِ سیاچین اعجاز احمد ۲۹
جڑواں بھائی یلیہ افضل ۳۵
گروجی کے کمالات طاہر مسعود ۳۷
اسکیٹنگ اسامہ بن سلیم ۴۰
پاکستانی غذائی مچھلیاں حماد احمد ہاشمی ۴۲
بوڑھے آدمی کی فریاد عبدالحفیظ ظفر ۴۶
دُنیا کا مشکل ترین کورس عقیل عباس جعفری ۵۰
پلیٹو محمد عادل منہاج ۵۱
یقین کی جیت منیر احمد راشد ۵۹
ہر روز کی اُلجھن عمارہ احمد ۶۴
پھر یاد وطن کی آتی ہے اے نان خرم بٹ ۶۵

۷۰ فاروق عادل وہ مردِ درویش

۷۵ سلیم مغل بیدار قوم ہونہار بچے

۸۰ عمران فیصل صدیقی غلطی میری تھی

۸۳ آصف فرخی چیزوں کی کہانی

۸۷ اسد محمود راؤ چشمِ تصوّر

۹۱ سفیان ناصر ڈیورا سرکس

۹۴ عبدالقادر بگلا پکڑنے کی ترکیب (نظم)

۹۵ قارئین گُلگُلے

۹۹ ساجد سعید ورزش

۱۰۵ اخگر انوار اعوان ہائے ری سردی

۱۰۶ کاشف طاہر انڈے کا کھیل

۱۰۷ سید نظر زیدی آزادی

۱۱۵ نیرّہ بخت ناز چاند پر تتلیاں

۱۱۸ محمد بن مالک ذہن کے حیرت انگیز کمالات

۱۲۳ ننھے ادیب قلم قتلے

۱۳۸ ہما سلیم امی ابو کا صفحہ

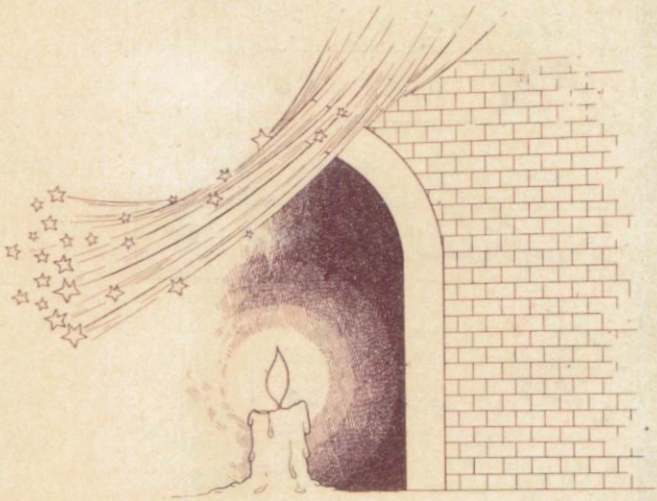

شیخ سعدی لکھتے ہیں۔

"میری عادت تھی کہ نماز فجر کے لئے صبح سویرے بیدار ہو جاتا تھا اور دیر تک عبارت میں مصروف رہتا تھا..... ایک دفعہ نماز فجر کے بعد میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ میرے والد کے علاوہ گھر کے دوسرے لوگ گہری نیند کے مزے لے رہے تھے..... میں نے فخریہ انداز میں والد سے کہا۔

"ان میں سے کسی کو توفیق نہیں کہ صبح اٹھ کر نماز ہی پڑھ لے۔ مُردوں سے شرط باندھ کو سو رہے ہیں۔"

والد نے مجھ سے کہا۔ "بیٹا! دوسروں کے عیب نکالنے سے یہ بہتر تھا کہ اس وقت تم بھی سو رہے ہوتے۔"

پہلی بات

زندگی کے کسی بھی معاملے پر سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ مثبت، اور دوسرا منفی کہلاتا ہے۔ مثبت طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی مسئلہ درپیش ہو تو آپ اسے حل کرنے اور سلجھانے کی کوشش کریں۔ اور منفی طریقہ یہ ہے کہ مسئلے کو سلجھانے کے بجائے الجھا دیں۔ اسے اور پیچیدہ بنا دیں۔ پہلا طریقہ تعمیری ہے اور دوسرا تخریبی۔ تعمیر میں دشواری تو ہوتی ہے لیکن سکون و اطمینان اسی میں ہے۔ تخریب اور بگاڑ میں آسانی ہے لیکن اس میں پریشانی اور سراسر نقصان ہے۔

اسی اصول کی روشنی میں آپ اپنے گرد و پیش میں نظر دوڑائیں تو معلوم ہو گا مثبت اندازِ فکر رکھنے والے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے اور ان کی تعداد جتنی کم ہے مسائل اتنے ہی زیادہ ہیں۔ جن لوگوں کا انداز فکر مثبت ہوتا ہے ان میں صبر و تحمل، قوت برداشت، سوجھ بوجھ اور سوچ بچار کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ منفی سوچ رکھنے والوں کی طرح وہ بات بات پر شکوے شکایت، غصے اور اشتعال، بے صبری اور جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ بحث و مباحثے کے دوران، لڑائی جھگڑوں کے مواقع پر یا کسی مسئلے کو حل کرتے ہوئے وہ اپنا دل و دماغ ٹھنڈا رکھتے ہیں۔ اپنی عزت و وقار کا خیال رکھتے ہیں اور اپنی کسی حرکت اور عمل سے دوسروں کو تکلیف نہیں پہنچاتے۔ اسی لئے ایسے لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ وہ ہر مشکل پہ قابو پا لیتے ہیں۔ اور سب کی نظروں میں پسندیدہ ہوتے ہیں۔

مثبت سوچ میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اور یہ طاقت اسی صورت میں آدمی کے اندر پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنا زاویۂ نظر تبدیل کر لے۔ زاویۂ نظر کا مطلب یہ ہے کہ میز پہ اگر آدھا گلاس پانی رکھا ہو تو وہ یہ نہ کہے کہ آدھا گلاس خالی ہے بلکہ یہ دیکھے کہ آدھا گلاس، پانی سے بھرا ہوا ہے۔ یعنی وہ ہمیشہ

روشن پہلوؤں پہ نظر جمائے رکھے۔ اس سے ذہن صحت مند رہتا ہے اور دل میں حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ مایوسی، محرومی اور احساسِ ناکامی کے جذبات قریب نہیں پھٹکتے۔ کیوں کہ یہ جذبات آخر کار آدمی کو گھن کی طرح چاٹ جاتے ہیں۔

مثبت سوچ ایک دم پیدا نہیں ہو جاتی۔ بلکہ یہ صفت دل و دماغ کی تربیت سے جنم لیتی ہے۔ جب بھی آپ اپنے کسی دوست، عزیز و اقارب، پڑوسی، اساتذہ اور والدین کے بارے میں کوئی رائے دے رہے ہوں یا کسی مسئلے پر گفتگو کر رہے ہوں۔ آپ کو یہ غور کر لینا چاہئے کہ آپ کی سوچ مثبت ہے۔ یا منفی۔ آپ کسی شخص یا مسئلے کے مثبت پہلوؤں پر زور دے رہے ہیں یا منفی پر۔ اگر جواب منفی میں آئے تو اپنے آپ کو روک لیجئے۔ ایسی گفتگو سے خاموشی بہتر ہے۔ اور ایسی سوچ سے نہ سوچنا افضل ہے۔ آپ میں مثبت انداز میں سوچنے کی عادت مستحکم ہو جائے تو آپ خود محسوس کریں گے کہ آپ کی شخصیت بدل گئی ہے۔ اور صرف بدلی نہیں پہلے سے زیادہ مضبوط بھی ہو گئی ہے۔

آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

اکتوبر ۱۹۹۱ء کے شمارے میں "میرے ابّو" کے عنوان سے ایک بچی کی متاثر کن تحریر شائع ہوئی تھی۔ اس کی تعریف میں قارئین کے خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ یہ تحریر پشاور کی سیّدہ سائرہ اعجاز کی تھی۔ (ادارہ)

"ماں جی"
آپ ہزار برس جییں

ستمبر کے شمارے میں شائع ہونے والے رمیصا سلیم کے مضمون "میجر عزیز بھٹی" میں میجر شہید کی والدہ کی تصویر کے ساتھ سہواً "مرحومہ" لکھ دیا گیا تھا۔ میجر صاحب کے بھائی نذیر احمد بھٹی صاحب نے اپنے ایک خط کے ذریعے ہمیں مطلع کیا کہ ہماری والدہ محترم اللہ کے فضل و کرم سے حیات ہیں اور ان کی عمر ۹۴ سال ہے۔

ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میجر عزیز بھٹی شہید کی والدہ کو طویل عمر عطا فرمائے اور ہمیشہ صحت مند و تندرست رکھے۔

ہماری اس نادانستہ غلطی سے آپ کی جو دل آزاری ہوئی ہے اس پر ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں۔

ہمارا پیارا خُدا

ضیاؔ اسلام پوری

بنائے ہیں جس نے زمیں آسماں
اُگائی ہیں جس نے ہری کھیتیاں
بسائی ہیں جس نے یہ سب بستیاں
ہر اک شے سے ہے جس کی قدرت عیاں
وہی ہے ہمارا پیارا خدا
وہی ہے ہمارا سہارا خدا

اشارے پہ جس کے ہے پانی رواں
ہوا اور بادل پہ ہے حکمراں
یہ چڑیاں یہ طوطے یہ مرغابیاں
ثنا میں ہیں سب جس کی رطبُ اللّساں [1]
وہی ہے ہمارا پیارا خدا
وہی ہے ہمارا سہارا خدا

مظاہر ہیں قدرت کی جس کے چمن
ہیں جس کے مکاں دشت باغ و دمن
وہ جس کی ہیں صنعت یہ گل پیرہن
یہ سرو و سمن نسترن و نسترن [2]
وہی ہے ہمارا پیارا خدا
وہی ہے ہمارا سہارا خدا

[1] تعریف کرنے والا [2] مختلف قسم کے پھول

سورۃ فاتحہ

کا مسلمانوں سے سوال

اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے
نام اللہ کا اور کام شیطان کے

تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے
تعریف اللہ کی، تقلید غیر اللہ کی

رحمان اور رحیم ہے
رحمان و رحیم وہ، انعام و اکرام کی اُمید کسی اور سے

روزِ جزا کا مالک ہے
روزِ جزا کا مالک وہ، خوفِ سزا کسی اور سے

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور
عبادت اس کی، اطاعت غیروں کی

تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں
مالک و مددگار وہ، طلب و اعانت دوسروں سے

دِکھا ہمیں سیدھا راستہ
راستہ وہ دکھائے، رہبر کوئی اور ٹھہرے

اُن لوگوں کا راستہ جن پر تُو نے انعام فرمایا
آخر اُن لوگوں میں ہم کیوں شامل کئے جائیں جن پر

جو معتوب نہیں ہوئے
انعام ہوا کہ انعام تو فرمانبرداروں کا حق ہے۔

جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں
اُن لوگوں میں سے کیوں نہ ہوں جن پہ غضب ہوا
کہ غضب ہی نافرمانوں کا مقدّر رہے۔

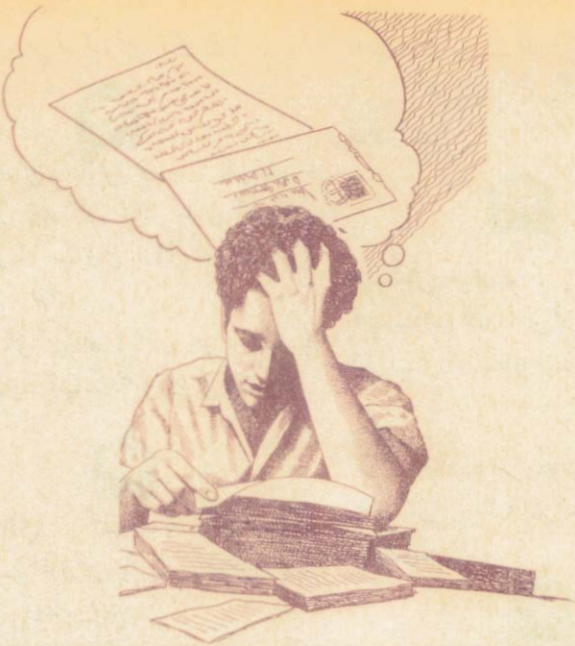

بہ خدمت جناب

عبدالرحمٰن عرفی ..... ڈی آئی خان۔ یہ خط میں چھوٹے بھائی کی فرمائش پہ لکھ رہا ہوں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ تمہارا خط شائع نہیں ہو گا لیکن اس کا کہنا ہے کہ یہ کیسا رسالہ ہے جو بچوں کے خط شائع نہیں کرتا ؟

○ ..... آپ نے ہماری طرف سے اپنے بھائی کو بدگمان کیوں کیا؟ بچوں کے خط تو شائع ہوتے ہیں، اور زیادہ تر ایسے خط جن میں کام کی باتیں ہوتی ہیں۔

محمد فاروق شمشیر بھٹی، ڈونگہ بونگہ، بھاولپور.....
مجھے آنکھ مچولی سے محبت تھی، محبت ہے، محبت رہے گی اور اگر زندہ رہا تو اور بھی خط لکھوں گا.....
میرے کتنے رسالے جل چکے ہیں، کتنے پھاڑ دیئے گئے ہیں اور کتنی ہی بار مار پڑی ہے اور ایک آپ ہیں کہ حوصلہ پست کئے جا رہے ہیں۔

○ ..... چلئے آپ کے ساتھ ہم بھی نعرہ لگاتے ہیں "محبت زندہ باد" لیکن بھائی آپ کو مار کیوں پڑی؟

کیا امتحانات میں نمبر کم تو نہیں آ گئے تھے؟

جویریا نورین، حاصل پور ..... اس دفعہ کا آنکھ مچولی پسند نہیں آیا۔ کہانیاں بھی خاص نہیں تھیں۔ آپ ذہنی آزمائش کا سلسلہ شروع کر دیجئے ..... فوراً۔

○ ..... بھئی کس دفعہ کا؟ ..... مہینہ تو آپ نے لکھا ہی نہیں۔ آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔

سکینہ شیرازی ..... آپ سے مجھ کو شکایت ہے کہ آپ میرے خطوط نہیں چھاپتے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرا یہ خط ضرور چھاپیں گے۔

○ ..... لیجئے آپ کا یقین تو پورا ہوا۔ مگر یہ بتایئے کہ آپ نے خط میں تو کچھ لکھا ہی نہیں۔ شہر کا نام تک نہیں لکھا۔ کیوں؟

محمد شہزاد، فیصل آباد ..... میں آپ سے خط و کتابت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے تفصیل سے لکھئے کہ آپ رسالے کی قیمت کیا لیتے ہیں؟

○ ..... آپ نے بس اتنی سی بات کے لئے ایک روپیہ ضائع کیا۔ رسالے کا چندہ تو رسالے میں لکھا ہوتا ہے۔

کاشف کمال، میرادخیل ..... ستمبر کے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ایم ایم عالم نے ایک فائر کر کے دشمن کے ۱۱ طیارے مار گرائے یہ اطلاع صحیح نہیں ہے۔

○ ..... غلطی پکڑنے کا شکریہ مگر یہ بھی تو بتایئے کہ صحیح تعداد کیا ہے؟

طیب جمیل، سیالکوٹ ..... یہ سائنس کا زمانہ ہے اور آپ نے اب تک سائنس نمبر شائع نہیں کیا۔ میرا خیال ہے اس تجویز سے دوسرے قارئین بھی متفق ہوں گے۔

○ ..... دوسرے قارئین چاہے متفق نہ ہوں لیکن ہم ضرور متفق ہیں۔ انشاء اللہ آپ کی یہ فرمائش پوری کی جائے گی۔

عبدالستار، تحصیل بورے والہ، ضلع وہاڑی ..... نظر زیدی صاحب نے ناول آزادی، میں ویبل کے قلع کی فتح تفصیل سے نہیں لکھی ..... آئندہ قسطوں میں تفصیل بیان کریں تاکہ بچے اپنی تاریخ سے واقف ہو سکیں۔

○ ..... آپ کی خواہش، نظر زیدی صاحب تک پہنچا دی جائے گی۔ لیکن ناول تو وہ مکمل لکھ چکے ہیں۔

محمد شاہد امین، شیخوپورہ ..... مجھے کالج سے چھٹی تھی، گھر میں بور ہو رہا تھا۔ اچانک آنکھ مچولی ہاتھ لگ گیا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کیوں کہ یہ رسالہ ہر اعتبار سے اچھا ہے۔

○ ..... ہم آپ کو اپنی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ ویسے آپ کو چھٹی گزارنے کی بھی پہلے سے منصوبہ بندی کرلینی چاہئے۔

شاہد مہر علی، ہیر آباد، حیدر آباد ..... روزنامہ "فاران" نے حیران کردیا۔ میرے اسکول میں ہمسوں اور لڑکیوں، سب کو پسند آیا۔ ہم سب کی متفقہ رائے ہے کہ آپ اسے ہفت روزہ اخبار کی طرح نکالئے۔ ہم لوگ اسی ٹائم مشین کے ذریعے ماضی میں سفر کرنا پسند کریں گے۔

○ ..... ہفتہ وار نکالنا تو مشکل ہے ..... البتہ خاص خاص اسلامی مہینوں اور واقعات کے حوالے سے اسے نکالا جا سکتا ہے۔ آپ کی طرح ہمیں بھی پسند آیا۔

محمد آصف ناز، سرگودھا ..... میں نے حال ہی میں کہانیاں لکھنی شروع کی ہیں۔ کیا آپ میری حوصلہ افزائی کریں گے؟

○ ..... پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے لکھنے سے پہلے پڑھا کتنا ہے؟ پہلے خوب پڑھئے اور پھر لکھنے کی طرف آیئے۔ یہ رسالہ آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لئے نکالا گیا ہے۔

ستارہ انجم شیخ، ٹنڈو آدم ..... آپ ایک "مقابلہ نمبر" نکالئے جس میں ہر تحریر کا مقابلہ ہو اور اس پر انعام دیا جائے۔ لیکن مقابلہ نئے لکھنے والوں کے درمیان میں ہونا چاہئے نا انکل، ورنہ پرانے اور تجربہ کار لکھنے والوں کے آگے تو نئے لکھنے والے آؤٹ ہو جائیں گے۔

○ ..... مقابلہ ہی ہونا ہے تو پھر نئے اور پرانے کا کیا سوال۔ جو جیت گیا وہ جیت گیا جو ہار گیا سو ہار گیا۔

محمد طاہر، لاہور ..... آئندہ خاص شمارہ "شرارت نمبر" ہونا چاہئے۔ اس میں نامور ہستیوں کی بچپن کی شرارتیں تحریر کرنی چاہئیں۔ اور اس کے ساتھ جاوید اقبال کارٹونسٹ کی شوخ لکیروں کا تحفہ دیجئے۔

○ ..... اسے پڑھ کر آپ بھی شریر تو نہیں ہو جائیں گے۔ پہلے اس کا یقین دلائیں۔ جاوید اقبال کارٹونسٹ کے تو ہم بھی مداح ہیں۔ آپ انہیں اس کے لئے آمادہ کر لیجئے۔

جاوید اقبال شہزاد، ڈھونکہ، ضلع میانوالی ..... انکل! مقابلۂ مصوری کو ہر ماہ شامل کیا کیجئے۔ اور تصویروں کا انتخاب قارئین پر چھوڑ دیا کیجئے۔

○ ..... آپ کی فرمائش تو پوری ہو رہی ہے۔ قارئین سے فیصلہ کرانے میں دیر ہو جاتی ہے۔

عمران سہیل بوبی، اوکاڑہ ..... ہم لوگ کتنی چاہت سے آپ کو خط لکھتے ہیں اور آپ انہیں بغیر سوچے سمجھے کراچی کے سمندر میں بہادیتے ہیں۔ کیا آپ پر ہمارے لکھنے کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔

○ ..... آپ کی چاہت کا ہمیں احساس ہے لیکن

آپ لوگوں کے چاہت بھرے خطوط چھاپنے کے لئے بھی سمندر جتنا بڑا رسالہ چاہئے۔ وہ کہاں سے لائیں۔

قیصر محمود قیاسی، مانسہرہ ..... پچھلے چند ماہ سے رنگین صفحات کم ہوتے جارہے ہیں جب کہ قیمت وہی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ دونوں ہاتھوں سے ہمیں لوٹ رہے ہیں۔ ویسے فاران، کا قیمتی تحفہ پسند آیا۔

○ ..... رنگین صفحات کی شکایت تو اب دور ہو جانی چاہئے۔ اور آپ کو کیا پتا کہ ہم لوٹ رہے ہیں یا خود لٹ رہے ہیں۔

مختار احمد شیرازی، ٹنڈو آدم ..... آپ کوئی نیا معلوماتی سلسلہ شروع کیجئے کیوں کہ اس کے بغیر رسالہ بے جان لگتا ہے۔

○ ..... واقعی آپ لوگوں کے صبر کا کافی امتحان ہو چکا ..... انشاء اللہ نیا معلوماتی سلسلہ جلد شروع کر دیا جائے گا۔

عائشہ امجد، لاہور ..... میں آنکھ مچولی باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ سب میرا مذاق اڑاتے ہیں کہ اتنی بڑی ہوگئی ہو مگر بچوں کا رسالہ پڑھنا نہیں چھوڑا۔ لیکن آنکھ مچولی میں ایسی کوئی خامی نہیں کہ جس کی بنیاد پر میں اسے پڑھنا چھوڑ دوں۔

○ ..... آپ لوگوں کے کہنے سننے میں نہ آئیں۔ معلومات جہاں سے بھی ملیں انہیں حاصل کرنا چاہئے اور پھر آنکھ مچولی بہت چھوٹے بچوں کا رسالہ نہیں ہے۔

مختار احمد، پشاور ..... آپ میری تحریریں "کمسن قلمکار" کے صفحات میں کیوں شائع کر دیتے ہیں۔ میں کوئی کمسن تو نہیں۔

○ ..... آپ کو ہم آپ کی تحریروں سے پہچانتے ہیں۔ اور تحریریں کم سن ہوں تو ہمارا کیا قصور؟

ناصر محمد شنواری، ہنگو ..... اس مرتبہ رسالہ وقت پر آگیا، خوشی ہوئی لیکن یہ خوشی اسی وقت ختم ہوگئی کیونکہ ہمارے شمارے کے ساتھ تحفہ نہ تھا۔۔۔۔ ہمیں بہت دکھ ہوا۔ ویسے رسالہ بہت شاندار تھا۔

○ ..... ہمیں چھوٹے شہروں سے ایسی شکایتیں ملی ہیں جو ہاکر ایسا کرتے ہیں وہ اپنے پیشے سے بددیانتی کرتے ہیں۔ اللہ انہیں ایماندار بنائے۔

زاہد خیر محمد مغل، حیدر آباد ..... وزیر اعظم نواز شریف صاحب کو میرا مشورہ ہے کہ پاکستان کے کروڑوں عوام سے ایک ایک روپیہ وصول کر کے غیر ملکی قرضے ادا کر دیں اسی طرح ہم غیر ملکی امداد کے بوجھ سے نجات حاصل کر لیں گے۔

○ ..... قرضہ بہت زیادہ ہے اور اس طرح پورا نہیں ہوگا۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم کفایت شعاری کی عادت ڈالیں۔ اور حکومت بھی اسی پالیسی پر چلے تو ہم اپنے اخراجات کم کر سکتے ہیں۔

افریقہ کے یہ دو ہاتھی لڑ نہیں رہے، محض کھیل رہے ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اس طرح کے کھیل سے ہاتھی اپنے اندر مستقبل میں بیرونی حملہ آوروں یا خطرات سے مقابلے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔

شمالی امریکہ کے برفانی علاقوں میں رہنے والے دو الو جن کی عمریں صرف ۴۲ دن ہیں۔ ابتدائی دس روز تک ان کا رنگ سفید تھا، پھر بھورا ہونا شروع ہو گیا۔ رنگ کی یہ تبدیلی ان کی حفاظت کا حصہ ہے اس رنگ کے ساتھ وہ جھاڑیوں میں بیٹھے نظر نہیں آتے اور آفتوں سے بچے رہتے ہیں۔

انسانِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم

محمد یوسف اصلاحی

کردار کی ہیبت

قبیلہ اراش کا ایک شخص مکّے میں اپنے اونٹ بیچنے کے لئے لایا۔ ابو جہل نے اس سے سارے اونٹوں کا سودا کرلیا۔ اونٹ قبضہ میں کرنے کے بعد ابو جہل نے قیمت ادا کرنے میں ٹال مٹول شروع کردی، اراشی کئی روز مکے میں ٹھہرا رہا، مگر ابو جہل برابر حیلے بہانے کرتا رہا۔ جب اراشی تنگ آگیا تو اس نے ایک روز حرم کعبہ میں پہنچ کر قریش کے سرداروں کو اپنی بپتا سنائی اور فریاد کی کہ میرا حق ابو جہل سے دلوادو............ میں ایک غریب الوطن مسافر ہوں، خدارا میری مدد کرو۔

اتفاق کی بات جس وقت قریش کے سرداروں سے فریاد کر رہا تھا، خدا کے رسول ﷺ [illegible] کے ایک گوشے میں تشریف فرما تھے،......

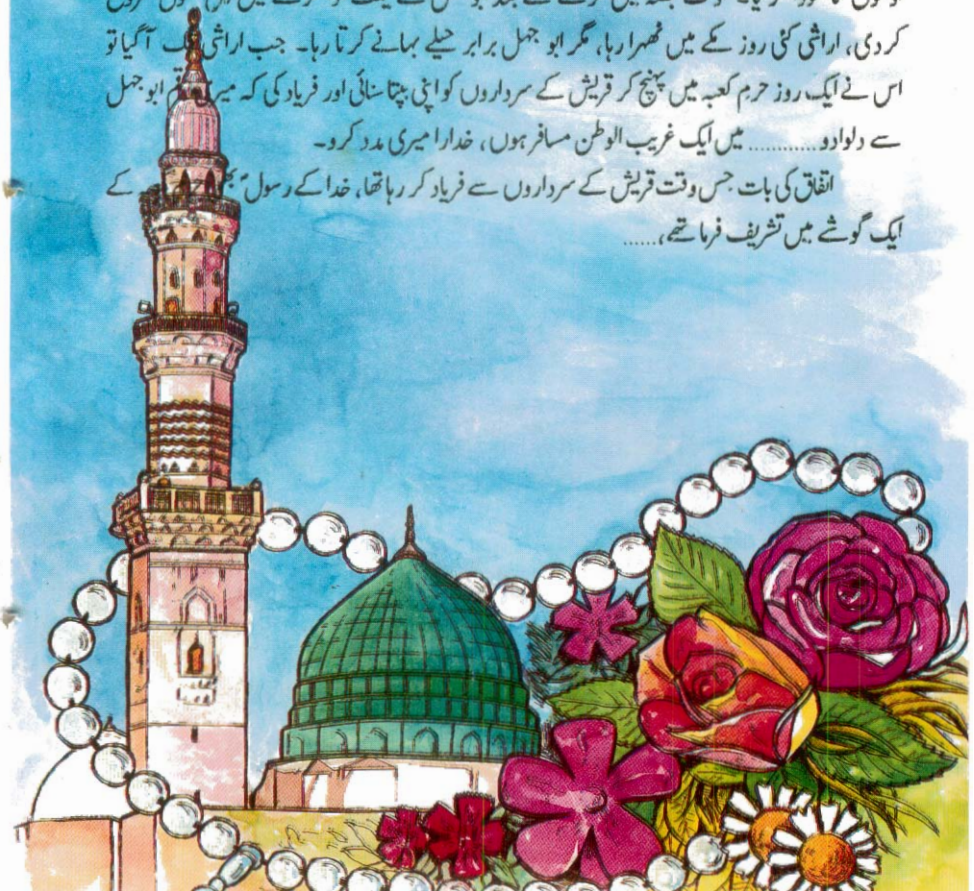

سرداران قریش کو مذاق سُوجھا، اور بولے، بھائی اس معاملہ میں ہم کچھ نہیں کر سکتے، ہاں دیکھو، حرم کعبہ کے اس گوشے میں وہ جو ایک صاحب بیٹھے ہیں بڑے بااثر ہیں ان کے پاس جاؤ۔ اور ان کے سامنے اپنا مقدمہ رکھو، وہ ضرور تمہاری رقم دلوادیں گے۔

..... سرداران قریش نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرادیئے کہ اب مزہ آئے گا۔ وہ ابوجہل کو محمدؐ سے الجھا کر لطف لینے کے خواہش مند تھے۔ مظلوم اراشی اپنی فریاد لے کر اللہ کے رسولؐ کے پاس گیا، آپ کو سارا ماجرا سنایا اور درخواست کی کہ ابوجہل سے میری رقم دلوادیجئے، یہ ظالم کئی روز سے ٹال مٹول کر رہا ہے اور میں یہاں بے یارومددگار ہوں، کوئی نہیں جو میرا ساتھ دے سکے۔

خدا کے رسولؐ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے، اور اراشی کے ساتھ سیدھے ابوجہل کے مکان پر پہنچے۔ باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ابوجہل نے اندر سے پوچھا، کون؟ آپ نے فرمایا "محمدؐ"۔

ابوجہل حیران ہو کر باہر نکل آیا۔ اور خدا کے رسولؐ کو دیکھ کر اس کا رنگ فق ہوگیا۔ آپؐ نے رعب دار آواز میں کہا "تم نے اس اراشی سے اونٹ خریدے ہیں، فوراً اونٹوں کی رقم لاکر اس شخص کو دے دو۔"

ابوجہل کچھ کہے بغیر سیدھا گھر میں گیا، اور رقم لاکر خاموشی کے ساتھ اراشی کے ہاتھ پر رکھ دی۔

قریش کے سرداروں نے اراشی کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ کرکے ایک آدمی پیچھے پیچھے بھیج دیا تھا، کہ جو کچھ گزرے وہ اس کی خبر ان کو لاکر دے ..... قریش کے اس مخبر نے یہ ساری روداد سرداران قریش کو آکر سنائی۔ اس نے بتایا کہ آج میں نے وہ عجیب معاملہ دیکھا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا..... ابوجہل گھر سے باہر نکلا، تو محمدؐ کو دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا۔ اور جب محمدؐ نے اس سے کہا کہ اس اراشی کی رقم لاکر دے دو۔ تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ابوجہل کے جسم میں جان ہی نہیں ہے..... وہ بغیر کچھ کہے خاموش گھر کے اندر گیا..... اور رقم لاکر اس شخص کے ہاتھ پر رکھ دی۔

قریش کے سرداروں کو حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ انہوں نے ابوجہل کو بہت ملامت کی کہ بڑا بزدل نکلا ابوجہل نے کہا کم بختو! تمہیں کیا بتاؤں کہ مجھ پر کیا گزری جس وقت اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور میں نے اس کی آواز سنی تو اس کی ہیبت اور رعب سے میری کچھ ایسی حالت ہوگئی جیسے کوئی بے جان پتلا ہو۔ اور بے اختیار لرزتے کانپتے میں نے وہ سب کچھ کیا، جس کی تمہیں خبر لانے والے نے خبر دی۔

محسن آقا

آٹھ سال کے ایک معصوم بچے کو اس کی ماں سُعدیٰ اپنے میکے لے کر گئیں، سُعدیٰ قبیلہ طے کی ایک شاخ بنی معن کے لڑکے ثعلبہ کی بیٹی تھیں، جن کی شادی قبیلۂ کلب کے ایک شخص حارثہ بن شرجیل سے ہوئی تھی۔ سُعدیٰ اپنے پیارے بیٹے کو اپنے میکے لے کر گئیں تو وہاں ایک انتہائی قیامت خیز حادثہ پیش آیا۔ قبیلہ بن قین بن جبیر کے لوگوں نے ان کے پڑاؤ پر دھاوا بول دیا۔ سب کچھ لوٹ کر لے گئے یہ ظالم جن لوگوں کو پکڑ کر لے گئے ان میں سُعدیٰ کا پیارا بچہ "زید" بھی تھا۔

ان دنوں طائف کے قریب عکاظ کا میلہ لگتا تھا، جس میں ہر طرح کی ضرورت کا سامان بکتا تھا، اسی میلے میں یہ لوگ زید کو بیچنے کے لئے لے کر پہنچے اور حکیم بن حزام نے بچے کو خرید لیا۔ حکیم بن حزام حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے، حکیم بن حزام کو بچہ بہت پسند آیا، وہ اسے لے کر اپنی پھوپھی کے پاس پہنچے اور اپنی پھوپھی کی خدمت میں اسے نذر کر دیا..... کچھ ہی عرصے کے بعد حضرت خدیجہؓ کا نکاح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوگیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیارے بچے کو حضرت خدیجہؓ کے یہاں دیکھا تو اس کی عادات و اطوار آپ کو بہت پسند آئیں اور آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے اس بچے کو مانگ لیا۔

حضرت زیدؓ کی قسمت کھل گئی..... اور وہ سرور کائنات کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر صرف پندرہ سال تھی، اس کے چند سال بعد ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا۔ حضرت زیدؓ آپؐ کی خدمت میں رہتے رہے اور ان کی یہ خدمت گزاری اور غلامی رنگ لائی۔ تاریخ کی کتابوں میں ان کو محبوب رسولؐ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور حضور کی معیت اور سرپرستی میں سب سے بڑی سعادت جو حضرت زید کو ملی وہ یہ کہ خدا نے اپنی آسمانی کتاب میں ان کا ذکر فرمایا دن گزرتے رہے اور زید حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے رہے، ادھر ان کے والدین کو پتہ چلا کہ ان کا جگر گوشہ مکے میں ہے، زید کے والد حارثہ اور چچا کعب تلاش میں نکلے اور تلاش کرتے کرتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔

حارثہ:۔ آپ انتہائی کریم اور شریف انسان ہیں، ہمارے بچے کو ہمارے ساتھ کر دیجئے۔ اس کی جدائی کے صدمے سے اس کی ماں کا بُرا حال ہے، اور ہمارا سکون بھی جاتا رہا ہے آپؐ جو فدیہ فرمائیں گے حاضر ہے، مگر بچے کو ہمارے ساتھ کر دیں۔

کعب:۔ آپؐ کے اخلاقِ کریما سے ہمیں پوری طرح توقع ہے کہ آپؐ ہمارے بچے کو ضرور

ہمارے حوالے کر دیں گے، اس کے بدلے میں آپؐ جو فدیہ چاہیں گے وہ ہم بلا تامل آپؐ کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔

حضرت محمدؐ :۔ بے شک اپنے جگر گوشے کی جدائی تمہارے لئے بہت شاق ہوگی اور اس کی ماں بھی اس کے غم میں بے قرار ہوگی ..... میں زید کو بلاتا ہوں، میری طرف سے بالکل اجازت ہے اگر وہ تمہارے ساتھ جانا پسند کرے تو میں ہرگز کوئی فدیہ نہ لوں گا۔ تمہارا بچہ ہے، تم اسے بالکل لے جاسکتے ہو، ہاں اگر وہ میرے پاس رہنا ہی پسند کرے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جو شخص میرے پاس رہنا چاہتا ہو میں خواہ مخواہ اسے نکال دوں۔

حضرت محمدؐ کی یہ بات سن کر کعب اور حارثہ بہت خوش ہوئے اور بولے آپؐ نے تو یہ انصاف سے بھی بڑھ کر درست بات فرمائی ہے، بے شک آپؐ زید کو بلایئے اور اس سے معلوم کر لیجئے۔

زید کے والد حارثہ اور چچا کعب بجا طور پر یہ خیال کرتے تھے کہ زید جونہی انہیں دیکھے گا، ان سے لپٹ جائے گا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر روئے گا اور اتنے دنوں کی غلامانہ زندگی بسر کرنے کے بعد وہ آزاد ہو کر اپنے ماں باپ اور اپنے گھر کے لوگوں کے پاس پہنچنے کے لئے بے تاب ہو جائے گا۔

زید بلائے گئے ..... حضورؐ نے زید سے کہا، تم ان دونوں کو جانتے ہو؟ زید :۔ جی ہاں۔ یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا ہیں۔

حضرت محمدؐ :۔ اچھا تم ان دونوں کو بھی جانتے ہو اور مجھ سے بھی واقف ہو، میری طرف سے تمہیں پوری آزادی ہے تم چاہو تو ان کے ساتھ چلے جاؤ اور چاہو تو میرے ساتھ رہو۔

مگر یہ کسی عام انسان کے الفاظ نہیں تھے، خدا کے رسولؐ کے الفاظ تھے، حضرت زید اس عظیم ہستی کی غلامی میں تھے، جن کی غلامی کے مقابلے میں دنیا جہان کی بادشاہی ہیچ ہے۔

زید نے ایک نظر باپ اور چچا پر ڈالی اور حضورؐ کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"میں تو آپؐ کو چھوڑ کر اب کہیں نہیں جاسکتا۔"

حارث اور کعب نے خلاف توقع بیٹے کی طرف سے یہ بات سنی تو کہا زید! کیا ہم تمہارے باپ اور چچا نہیں ہیں، کیا تم آزادی کے مقابلے میں غلامی کی زندگی پسند کرتے ہو؟ اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتے ہو؟

زید کا دل دھڑکنے لگا آنسو جاری ہوگئے۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"ابا جان بے شک آپ میرے والد ہیں۔ بے شک یہ میرے چچا ہیں۔ بے شک میری ماں بھی مجھے یاد کر رہی ہوگی۔ لیکن میں بتا نہیں سکتا کہ میں نے کیا چیز دیکھی ہے اپنے آقا کے جو

اوصاف میں نے دیکھے ہیں، اب مجھے تا زیست ان کی غلامی ہی سب سے زیادہ محبوب ہے، اب میں دنیا میں کسی کو بھی اپنے محسن آقا پر ترجیح نہیں دے سکتا۔"

زید کا یہ جواب سن کر حارثہ اور کعب نے کہا، زید اگر ایسی بات ہے تو ہم خوشی سے تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ تم یہیں رہو، تمہاری خوشی ہمارے لئے سب کچھ ہے۔

حضورؐ نے اسی وقت زید کو آزاد کر دیا، اور حرم میں جاکر قریش کے مجمع میں اعلان فرمایا "آپ لوگ گواہ رہیں آج سے زید میرا بیٹا ہے۔ میں نے زید کو منہ بولا بیٹا بنالیا۔" حارثہ اور کعب حیران تھے کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں، کہ یہ کوئی خواب ہے، یا واقعی زمین پر کوئی عظیم فرشتہ اتر آیا ہے اور اس کے بعد قریش کے لوگ زید کو زید بن محمدؐ کے نام سے یاد کرنے لگے۔

وقت مشاہیر کی نظر میں

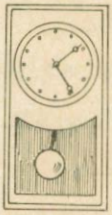

انتخاب:۔ سحر ناز، لاہور

امام غزالیؒ کی نظر میں۔

وقت کو پیچھے سے مت پکڑو۔ اسے آگے سے روک کر اس پر قابو پانے کی کوشش کرو۔ وقت خام مسالے کی مانند ہے جس سے جو کچھ چاہیں بنا سکتے ہیں۔

افلاطون کی نظر میں۔

وقت ایک ایسی زمین ہے جس میں محنت کئے بغیر کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ اگر محنت کی جائے تو یہ زمین پھل دیتی ہے اور اگر بے کار چھوڑ دی جائے تو اس میں خار دار جھاڑیاں اگ آتی ہیں۔

فیثا غورث کی نظر میں۔

وقت ضائع کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ وقت روئی کے گالوں کی مانند ہے عقل و حکمت کے چرخے میں کات کر اس کے قیمتی پارچہ جات بنالو۔ ورنہ جہالت کی آندھیاں اڑا کر دور پھینک دیں گی۔

شہید سیاچن

اعجاز احمد

یہ سچی کہانی پاک فوج کے شہید کیپٹن سالک نواز چیمہ کی ہے جس نے اپنی زندگی وطن پاک پر نچھاور کر دی۔ سالک ایک نیک دل خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے والد ایک پڑھے لکھے، رزق حلال کمانے والے انسان تھے۔ اس کی والدہ ایک تہجد گزار خاتون تھیں۔ ننھا سالک بھی اکثر تہجد کے وقت اٹھ کر اپنی امی کے ہمراہ جاء نماز پر کھڑا ہو جاتا۔ وہ بہت چھوٹی عمر میں اپنے ابو کے ساتھ مسجد جا کر نماز پڑھنے لگا۔ ذرا بڑا ہوا تو بہن بھائیوں کے ہمراہ اسکول جانے لگا اس کا اسکول دوسرے گاؤں میں تھا۔ وہ دوسرے بچوں کی طرح نہ تو آتے جاتے راستے میں فصلیں خراب کرتا نہ لڑتا جھگڑتا بلکہ اپنی امی کی یاد کرائی ہوئی قرآنی دعائیں پڑھتا ہوا اسکول جاتا تھا۔

جب وہ نویں جماعت میں پہنچا تو ایک مرتبہ گاؤں کی ایک عورت شدید بیمار ہو گئی گاؤں میں کوئی ڈاکٹر تھا اور نہ کوئی دوا، عورت کی تکلیف دیکھ کر سالک نے بڑے ہو کر ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ گاؤں کے دکھی اور بیمار لوگوں کے کام آسکے۔ سالک ڈاکٹر بننے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ پیش آگیا ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔ سالک پر اس سانحہ کا بہت اثر ہوا۔ انٹر کے امتحان میں سالک ضلع بھر میں اوّل آیا۔ وہ چاہتا تو کسی بھی پیشہ ورانہ یونیورسٹی میں داخلہ لے سکتا تھا لیکن وہ داخلے کے لئے آرمی ریکروٹنگ سینٹر پہنچ گیا۔ تحریری امتحان اور میڈیکل چیک اپ کے مرحلوں سے گزرتا ہوا وہ آئی۔ ایس۔ ایس۔ بی کا امتحان دے کر گھر واپس آگیا اور بے چینی سے نتیجہ کا انتظار کرنے لگا۔

کافی دنوں بعد ڈاکیہ اس کی کامیابی کی خبر

لے کر آیا تو خوشی سے اس کے آنسو چھلک اٹھے۔

ملٹری اکیڈیمی میں ٹریننگ اس کی توقع سے بھی سخت نکلی لیکن وہ ہر آزمائش میں کامیاب نکلا۔ اور آخر پاسنگ آؤٹ کا دن بھی آپہنچا۔ پاسنگ آؤٹ کے دن سالک کے امی، ابو بھی پہنچے ہوئے تھے ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے پاسنگ آؤٹ کے بعد کیڈٹ سالک سیکنڈ لیفٹننٹ اور پھر تین سال کے اندر اندر کیپٹن بن گیا۔ جب کبھی وہ تنہا ہوتا تو سوچتا "۷۱ء کا بدلہ چکانے کا وقت کب آئے گا؟"

اس کی زندگی میں ایک اور اہم موڑ آیا ایک مرتبہ تیئس مارچ کی مارچ پاسٹ میں حصہ لینے کے لئے وہ گیا تو اس نے کمانڈوز کی یونٹ کو قریب سے دیکھا۔ اور اس نے کمانڈوز یونٹ میں جانے کی درخواست دے دی۔ کمانڈوز کورس کی تربیت کے دوران جتنی سختیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں عام آدمی ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آٹھ آٹھ دس دس آدمیوں کی ٹانگوں، گھونسوں کا مقابلہ بیسیوں میل بغیر کھائے پیئے پیدل سفر، کئی کئی دن کی بھوک پیاس، جنگلوں، پہاڑوں، صحراؤں، دریاؤں میں بے یارومددگار چلنا، بڑھنا اور منزل کی تلاش کرنا۔ انتہائی بلندیوں سے چھلانگیں لگانا، بغیر ہتھیاروں کے دفاع اور حملہ کرنا، مختلف زبانوں پر عبور حاصل کرنا، ہر قسم کے بہروپ بھرنا جدید ترین ہتھیاروں کا استعمال جاننا اور دنیا بھر کے علوم کے رموز جاننا کمانڈوز کے کورس کا حصہ ہوتا ہے۔ اور جب کوئی فوجی کمانڈو بن جاتا ہے تو ہر وقت موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے لئے تیار رہتا ہے۔

کمانڈو بن کر بھی سالک کی بے چینی کم نہ ہوئی اور وہ دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع ملنے کی دعائیں کرتا رہتا۔ اور پھر کیپٹن سالک کی دعائیں منظور ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ پاکستان کے ازلی دشمن ہندوستان نے سیاچین گلیشیئر پر جنگ چھیڑ دی۔ سیاچین پاکستانی علاقے بلتستان کا حصہ ہے۔ بلتی زبان میں سیاچین کے معنی "جنگلی گلاب" کے ہیں۔ یہ علاقہ قراقرم پہاڑیں کے۔ ٹو کی چوٹی کے قریب ہے۔ یہ پاکستان کا دوسرا بڑا گلیشیئر ہے۔ اس کی بلندی ۱۶ ہزار فٹ ہے۔ اس پر اتنی زیادہ سردی ہوتی ہے کہ عام حالات میں کوئی فخر وہاں زندہ نہیں رہ سکتا۔ تقسیم ہندوستان کے وقت سے یہ علاقہ پاکستانی علاقہ تسلیم کیا جاتا ہے لیکن چونکہ اس علاقے میں کسی قسم کی فوج نہ تھی اس لئے ہندوستانی فوج نے اس گلیشیئر کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا۔ کیپٹن سالک کی کمپنی کو سیاچین گلیشیئر کی طرف جانے کا حکم ملا۔ کیپٹن سالک کی دل کی کلی کھل اٹھی۔

کیپٹن سالک نواز چیمہ اور اس کے ساتھی انتہائی دشوار گزار علاقوں سے گزرتے ہوئے کئی دنوں اور کئی راتوں کے بعد سیاچین گلیشیئر پہنچے وہاں سخت سردی تھی اور درجۂ حرارت منفی پچیس

درجہ سینٹی گریڈ سے بھی کم تھا ہوا میں آکسیجن کی کمی تھی، سانس تک لینے میں تکلیف ہوتی تھی۔ ہر وقت برف کے طوفان اور جھکڑ چلتے رہتے تھے، راستے میں کھائیوں میں گرنے اور لڑھکتے ہوئے برفانی تودوں کے نیچے دبنے کا خطرہ ہر لمحہ موجود رہتا تھا۔ مخصوص قسم کے نائیلون کے لباس سے جسم کا کوئی حصہ باہر نکلا رہ جاتا تو گولی سی لگ جانے کا احساس ہوتا لیکن کیپٹن سالک اور ان کے ساتھی جب گھر سے چلے تھے تو یہ سب سختیاں ان کی نگاہوں میں تھیں۔ ان کے دل میں وطن کی آرزو تھی۔ انہیں جتنی زیادہ تکلیف پہنچتی گئی ان کے عزائم اتنے ہی جواں ہوتے گئے۔

دشمن نے اونچی جگہوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اونچائی پر حملہ کرنے کو جانا ویسے ہی دشوار ہوتا ہے اور وہاں تو دشوار گذار برفانی چڑھائیاں تھیں۔

کیپٹن سالک ہر روز جب اپنے مورچہ سے باہر نکلتا تو سب سے پہلے اس کی نگاہ دور اونچائی پر دشمن کی چوکی کی طرف اٹھتی۔ وہ دوربین اٹھا کر دشمن کی نقل و حرکت دیکھتا۔ اپنی چوکی اور دشمن کی چوکی کے درمیان فاصلے کے متعلق سوچتا۔ راستے میں واقع چٹانوں اور کھائیوں کا حساب لگاتا، ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر فضائی مشاہدہ سے حاصل ہونے والی معلومات کو جانچتا، اپنی فوج کی انٹیلیجنس کی دی ہوئی رپورٹوں پر غور کرتا اور منصوبہ بناتا کہ دشمن سے وہ بلند و بالا چوٹی کیسے چھینی جاسکتی ہے۔

کیپٹن سالک نے تمام معلومات اکٹھی کر کے ایک منصوبہ بنایا اور اپنی کمپنی کے کمانڈر سے وقت لے کر ان کے پاس پہنچا اور کہا "سر یہ چوکی سر ہو سکتی ہے۔"

کیپٹن سالک نے کمانڈر کو اپنا پلان بتایا وہ خاموشی اور توجہ سے سنتے رہے۔ جب کیپٹن سالک سارا پلان سنا چکا تو اس نے سیلوٹ کیا اور واپس چلا آیا۔ اور پھر ایک دن دشمن سے چوکی چھیننے کے منصوبے کو آخری شکل دے دی گئی۔

کمپنی کمانڈر نے سارے افسروں اور جوانوں کو بلایا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"دشمن نے دھوکے، مکاری اور بین الاقوامی قوانین کی دھجیاں اڑاتے ہوئے ایک ایسے پاکستانی علاقے پر قبضہ کیا ہے جہاں کوئی فوج موجود نہ تھی۔ مادر وطن کا ایک ایک چپہ ہمیں جان سے پیارا ہے۔ یہ ہماری عزت، غیرت اور وقار کا سوال ہے۔ ہم نے اپنے علاقے میں واقع دشمن کی چوکی پر ہر قیمت پر قبضہ کرنا ہے۔ دشمن بلندی پر مضبوطی سے قدم جمائے ہوئے ہے۔ اس چوکی کی طرف بڑھنا یقینی موت کو دعوت دینا ہے۔ لیکن لہو کا نذرانہ دیئے بغیر وطن کی مانگ میں سیندور نہیں بھرا جاسکتا۔ جو افسر اور جوان رضاکارانہ طور پر حملہ میں حصہ لینا چاہیں کل صبح اپنا نام پیش کریں"۔

صبح جب ساری کمپنی میدان میں جمع ہوئی تو سب مجاہدوں کے چہروں پر پہاڑوں جیسا عزم تھا

اور جب کمپنی کمانڈر نے کہا کہ جو جوان اور افسر حملہ میں رضاکارانہ طور پر حصہ لینا چاہتا ہے ایک قدم آگے آجائے تو ایک افسر اور ایک مجاہد بھی پیچھے نہ رہا۔ سبھی ایک ایک قدم آگے بڑھ آئے کمپنی کمانڈر کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو اُمنڈنے لگے، اس کے لئے انتخاب مشکل ہوگیا۔ کمانڈر نے سب مجاہدوں کو ان کی روزمرّہ کی ڈیوٹی پر بھیج دیا اور خود آخری انتخاب کے لئے جوانوں اور افسروں کے نام لکھنے بیٹھ گیا۔

جن افسروں اور جوانوں کا نام منتخب کیا گیا ان میں کیپٹن سالک بھی شامل تھا۔ کمانڈر نے پیچھے رہ جانے والے مجاہدوں کو کہا کہ انہیں دل برداشتہ نہیں ہونا چاہئے کسی بھی لمحہ دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔

سیاچین گلیشیئر کا محاذِ جنگ دنیا کا سب سے اونچا جنگی میدان ہے اس محاذ پر لڑنا اور آگے بڑھنا سب سے مشکل کام تھا۔ جب کوئی مجاہد چلتا تو اس کے پاؤں برف میں دھنس جاتے۔ آکسیجن کی کمی سے ہر جوان کی طاقت کہیں کم ہو چکی تھی کسی قسم کی سواری میسر نہ تھی۔ سیدھی، سپاٹ، دیوار کی طرح کی بلندی پر چڑھنا ہی کم مشکل نہ تھا انہیں ہتھیار اور ایمونیشن بھی اٹھا کر سفر کرنا تھا۔ برفانی زمین پر پڑی ہوئی دراڑوں کو عبور کرنا، لڑھکتے ہوئے بھاری بھرکم برف کے تودوں سے بچنا اور سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتے ہوئے طوفانی جھکڑوں کا مقابلہ کرنا ایک الگ مشقت تھی۔ تمام مجاہد بیس بیس پچیس پچیس افراد کی ٹولیوں میں بکھر کر اپنے مشن کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہر گروپ میں دو دو تین تین افسر اور باقی جوان تھے۔ ہر گروپ کے پاس فوجی سازوسامان کے علاوہ رسّے، نائیلون کے لباس، نائیلون کے خیمے اور چھوٹی چھوٹی کدالیں تھیں۔ سب جوانوں نے رسّے باندھ کر ایک دوسرے کو تھام رکھا تھا۔ وہ برفانی میدان، بلندیاں، گھاٹیاں، چوٹیاں سر کرتے بڑھتے چلے گئے۔ وائرلیس کے ذریعے ان کا رابطہ ہیڈ کوارٹر سے قائم تھا۔ رات ہوئی تو وہ کدالوں سے برف کھود کر، گڑھے بنا کر، ان کے اوپر برف کے خیمے تان کر دبک کر بیٹھ گئے۔ اس وقت درجۂ حرارت صفر سے بھی پچاس ڈگری سینٹی گریڈ کم تھا جو ان ایک دوسرے سے باتیں کرکے اور مختلف جسمانی ورزشیں کرکے اپنے جسم کو گرم رکھ کر رات گزارنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ سونا ان کے لئے نقصان دہ ہے۔ ہوا میں آکسیجن کی کمی کی وجہ سے نیند ویسے ہی ان کی آنکھوں سے دور تھی۔ ان کے ہیڈکوارٹر اور دشمن کی چوکی کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ نہ تھا لیکن یہ راستہ اتنا دشوار گذار تھا کہ یہ تین دن رات کی مسافت بن گیا۔ اور یہ مسافت طے کرنا عام انسانوں کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ مقام شوق تھا اور یہ انہی کا کام تھا کہ جن کے حوصلے بلند تھے اور جن کی تمنا شہادت تھی۔ اپنی روحانی طاقت کے بل بوتے پر تمام مجاہد تین دن رات کی مسافت

طے کر گئے۔ اب وہ دشمن کی فائرنگ رینج میں تھے۔ دشمن مجاہدین کے حملے اور ان کی پیش قدمی سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اور ان پر ہتھیاروں کے منہ کھول چکا تھا۔ مجاہد لیٹ کر، چھوٹے چھوٹے برفانی ٹیلوں کی آڑ لے کر ایک ایک انچ رینگ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ پاکستانی ایریا ہیڈ کوارٹر سے میزائلوں اور توپوں کے فائر جاری تھے۔ دشمن کی چوکی پر بھی قیامت برپا تھی لیکن دشمن نے پہاڑ اور برف کے اندر ہی اندر طویل سرنگ بنا کر مورچہ کھود رکھا تھا۔ اور اس مضبوط مورچہ پر کوئی میزائل، کوئی توپ اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ دشمن چھپا ہوا، محفوظ اور بلندی پر تھا اور مجاہد بغیر کسی آڑ کے، غیر محفوظ اور نیچی جگہ پر تھے۔

کیپٹن سالک چیمہ اور اس کا گروپ سب سے آگے آگے تھا۔ انہوں نے اپنے گروپ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ ایک حصہ ایک جگہ ٹھہر کر فائرنگ کرتا اور دشمن کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائے رکھتا تو دوسرا حصہ ایڈوانس کرتا پھر دوسرا حصہ ایڈوانس کرتا تو پہلا حصہ فائرنگ کرتا۔ جوں جوں چوکی نزدیک آتی گئی جنگ کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ مجاہد کھائیوں میں گر کر، تودوں کے نیچے دب کر، برفانی ہواؤں میں اڑ کر، آکسیجن کی کمی کا شکار ہو کر اور دشمن کی فائرنگ کی زد میں آکر جام شہادت نوش کرتے گئے۔ مجاہدوں کی تعداد میں کمی واقع ہوتی گئی لیکن چوکی تک کا فاصلہ کم ہوتا گیا۔ کیپٹن سالک چیمہ کا ہیڈ کوارٹر سے وائرلیس پر رابطہ قائم تھا۔ کمپنی کمانڈر اور بریگیڈ کمانڈر ایک ایک لمحہ کی روئیداد سن رہے تھے۔ حوصلے بڑھا رہے تھے اور مشورے دے رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے "شاباش سالک۔ شاباش چیمہ بڑھے چلو، بڑھے چلو، دشمن کو کچل دو۔ تم نے یہ چوکی فتح کرنی ہے۔ تم نے دنیا بھر کے فوجی مبصروں کے اندازے غلط ثابت کرنے ہیں۔"

اور کیپٹن سالک چیمہ کہہ رہا تھا۔ "سر ہم بڑھ رہے ہیں، بڑھ رہے ہیں، بڑھ رہے ہیں۔ دشمن ہماری زد میں ہے۔ ہم دشمن کے ناپاک قدم اپنی مقدس سرزمین سے ہٹا کر دم لیں گے۔"

اچانک ایک گولی کیپٹن سالک چیمہ کی ران میں پیوست ہوگئی۔ خون کا فوارہ چلا۔ کیپٹن سالک لڑکھڑایا کہ ایک ساتھی جوان نے سہارا دیا اور کہا "سر آپ شدید زخمی ہوگئے ہیں، آپ رک جائیں، ہم ایڈوانس جاری رکھیں گے۔" کیپٹن سالک مسکرایا اور کہا "نہیں جوان معمولی زخم ہے۔" اس نے فیلڈ پٹی کس کر اپنے زخم پر باندھی اور آگے بڑھنا شروع کیا۔

لیکن آکسیجن کی کمی، برفانی پہاڑ کی چڑھائی اور بہتے ہوئے خون نے کیپٹن سالک کو جسمانی طور پر بہت کمزور کر دیا۔

"ہیلو ہیلو، کیپٹن سالک کیا پوزیشن ہے؟" ہیڈ کوارٹر نے صورتِ حال پوچھی "سر

ایڈوانس جاری ہے دشمن کی چوکی ہماری زد میں ہے۔" کیپٹن سالک نے نحیف آواز میں جواب دیا۔

"ہیلو ہیلو، کیپٹن سالک، آپ کی آواز اتنی مدہم کیوں ہے؟ آپ زخمی تو نہیں؟ سوال کیا گیا۔ کیپٹن سالک نے سوچا کہ اگر اس کے افسروں کو اس کے زخمی ہونے کی اطلاع مل گئی تو وہ کہیں اسے رک جانے کا حکم نہ دے دیں اس نے جواب دیا "نہیں جناب، میں بالکل ٹھیک ہوں، موسم کی خرابی کی وجہ سے آواز مدہم سنائی دے رہی ہوگی۔" کیپٹن سالک نے ہیڈ کوارٹر کو جواب دیا اور پھر اپنی تمام تر توجہ دشمن کی چوکی کی طرف مبذول کر دی۔

پاکستانی مجاہد دشمن کی شدید فائرنگ کی زد میں تھے۔ سامنے کوئی آڑ نہ تھی۔ بے شمار مجاہد زخمی ہو چکے تھے اور بہت سے جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ لیکن سب کے حوصلے بلند تھے۔ وہ اس وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکے تھے۔ وہ ہر احساس سے عاری ہو چکے تھے۔ اس وقت ان کی تمام تر توجہ ایک ہی نقطہ پر مرکوز تھی۔ انہوں نے چوٹی فتح کرنی تھی۔ ہر قیمت پر فتح کرنی تھی وہ کٹتے، مرتے آگے اور آگے اور آگے ہی بڑھتے جا رہے تھے۔ قضا و قدر کی تمام غیر مرئی طاقتیں ان غازیوں، ان پراسرار بندوں کی ناقابلِ یقین دلیری پر عش عش کر رہی تھیں اور ان کی مدد کر رہی تھیں۔ ایک ایک جوان کا جذبہ بیسوں دشمنوں کی طاقت پر بھاری تھا۔

اور پھر دست بدست لڑائی کا مرحلہ آپہنچا۔ جوانوں نے بڑی کوشش کی کہ کیپٹن سالک شدید زخمی ہونے کی وجہ سے پیچھے رہ جائیں لیکن سالک اس موقع پر بھی خوب تر کی تلاش کر چکا تھا۔ وہ اپنی تمام تر قوت کو مجتمع کر کے اُٹھا اُس نے ہینڈ گرنیڈ کی پن نکالی، کھڑا ہوئے اور گرنیڈ دشمن کی مشین گن پوسٹ کی طرف اچھال دیا۔ دشمن غافل نہ تھا۔ اس نے مشین گن کا رخ کیپٹن سالک کی طرف پھیر دیا۔ بیسوں گولیاں کیپٹن سالک کے جسم کے آر پار ہو گئیں۔ ادھر گرنیڈ بھی ایک دھماکے سے پھٹا۔ کیپٹن سالک ایک ہی لمحہ میں اس فانی دنیا کے بندھنوں سے چھٹکارا پا کر حیاتِ ابدی حاصل کر گیا۔ دشمن کی مشین گن اور دشمن کی پوسٹ کے پرخچے اڑ گئے۔ چاروں طرف سے مجاہدوں نے دشمن کی پوسٹ کی طرف یلغار کر دی کیپٹن سالک کے پھینکے ہوئے گرنیڈ نے ہر طرف تباہی مچادی تھی۔ دشمن کے بہت سے سپاہی ہلاک اور زخمی ہو گئے تھے مجاہد چوکی پر قابض ہو گئے۔ دنیا بھر کے فوجی مبصرین کے اندازے غلط ہو گئے۔ پاکستانی مجاہدوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا فتح یاب جوان کیپٹن سالک کی طرف لپکے۔ لیکن وہ شہادت کا رتبہ حاصل کر چکا تھا اور سیاچین گلیشیئر کی چوٹی پر پاکستانی پرچم لہرا رہا تھا۔

جڑواں بھائی

ملیحہ افضل

امی ابّو تو کیا سب ہی کہتے تھے کہ میں اور آصف جڑواں بھائی ہیں۔ شکلیں بھی ملتی جلتی تھیں۔ مجھے تو ایسا نہیں لگتا تھا۔ کیوں کہ امی تو کہتی تھیں کہ جڑواں بھائی تو یک جان اور یک قالب ہی ہوتے ہیں مگر ہم دونوں کو دیکھ کر یہ بات غلط ثابت ہوتی تھی۔ کسی معاملے میں ہماری رائے ایک تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اور نہ اس رائے کو کوئی ایک کر سکتا تھا۔ کیوں کہ ہماری رائے کو ایک کرنا ایسا ہی تھا جیسے آسمان اور زمین کو باہم ملانا۔ اس کے مشغلے اور عادات مجھ سے یکسر مختلف تھیں۔ آصف ذرا کمزور تھا اور سال کے نو ماہ بیمار رہنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ جب کہ بقول دادو میں مُوا تو بہت تگڑا ہوں اور ضرور آصف کی چیزیں چھین کر کھالیتا ہوں۔ اب ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی، جب آصف کا کچھ کھانے کو جی نہ چاہتا تو وہ مجھے دے دیتا بھلا پھر میں کیوں کفرانِ نعمت کرتا۔

کل سے آصف پھر بیمار تھا۔ میرے لئے تو کوئی نئی بات نہ تھی کیوں کہ سال کے نو ماہ بیمار رہنا آصف کا محبوب مشغلہ تھا اور مجھے امید تھی کہ اب بھی وہ ایک ہفتہ بیمار ہو گا پھر ایک ہفتہ ٹھیک رہے گا اور ایک ہفتہ پھر بیمار ہو گا۔ یہ تو اس کی زندگی کا معمول تھا۔ لیکن اس دفعہ یہ معمول برقرار نہ رہا اور آصف شدید بیمار ہو گیا اور پھر وہ ہاسپٹل میں داخل ہو گیا۔ میں ان دنوں بہت اداس رہتا تھا مجھے ایسا لگتا جیسے میں ادھورا ہوں، میرے جسم کا کوئی حصہ مجھ سے الگ ہو گیا ہے۔ اوپر سے مجھے کوئی کچھ بتاتا بھی نہیں تھا ۔ یہ سب مجھے بچہ کیوں سمجھتے ہیں۔ آخر میں تیسری جماعت میں پڑھتا ہوں۔ لیکن مجھے کسی نے بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ خیر میں نے بھی اپنے دل میں آج تہیہ کر لیا کہ جو بھی ہو آج دادو سے ضرور پوچھوں گا۔ دادو حسبِ معمول مالا پڑھ رہی تھیں۔ امی جس طرح کی مالا گلے میں پہنتی تھیں، اسی طرح کی مالا کے

دانے گرا گرا کر دادو خوش ہوا کرتی تھیں۔ میں دادو کے پاس بیٹھ گیا اور پوچھا۔

"دادو آپ اس مالا کو گلے میں ڈالنے کی بجائے اس کے دانوں سے کیوں کھیلتی ہیں؟" دادو نے نہایت غصے سے مجھے دیکھ کر کہا۔

"عقل کے اندھے! یہ تسبیح ہے اور اس پر میں آصف بیٹے کی زندگی کے لئے وظیفہ کر رہی ہوں۔"

"دادو آصف کو کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔ دادو چپ ہو گئیں۔ لیکن میں نے بھی آج دل میں ٹھانی ہوئی تھی اس لئے بار بار پوچھنا شروع کر دیا، آخر تنگ آکر دادو بولیں۔

"آصف کے دونوں گردے ناکارہ ہو گئے ہیں اور اس کے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اسے کسی دوسرے انسان کا گردہ لگا دیں۔"

"تو لگا دیں نا دادو۔" میں بے صبری سے بولا۔ دادو کو غصہ آگیا (انہیں ہمیشہ بات کاٹنے پر غصہ آتا تھا۔)

"پوری بات تو سن لو۔" وہ غصے سے بولیں۔ "آصف کے کیس میں کچھ پیچیدگیاں ہیں اس لئے ڈاکٹروں کو گردہ نہیں مل رہا۔" دادو بات کر کے افسردگی سے چپ ہو گئیں۔

"دادو میں اور آصف جڑواں بھائی ہیں؟"

"ہاں۔" میرے پوچھنے پر دادو بولیں۔

"تو پھر آصف کو میرا گردہ لگا دیں۔" مجھے نہیں معلوم تھا کہ ابو پیچھے کھڑے ہیں۔ انہوں نے فوراً مجھے ساتھ لیا اور ہاسپٹل کی طرف ہو لئے۔ وہاں پر انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو ساری بات سمجھا دی۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا چیک اپ کیا اور ابو کو مبارکباد دیتے ہوئے آصف کی زندگی کی نوید سنائی۔ ابو خوش ہو گئے۔ ابو کو خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہو گیا۔

"کل آپریشن ہو گا۔" ڈاکٹر نے ابو کو بتایا۔ "اس کام میں جتنی جلدی کی جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

آج جب میں ہوش میں آیا تو میں بہت درد محسوس کر رہا تھا۔ میرے ساتھ والے پلنگ پر آصف لیٹا تھا وہ ابھی تک بے ہوش تھا تھوڑی دیر بعد جب وہ ہوش میں آیا تو پھر ڈاکٹر کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ امی، دادو اور ابو کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ آصف کو ہوش میں آتے دیکھ کر اور سب کو خوش دیکھ کر میں بھی اپنا درد بھول گیا اور خوش ہو گیا۔

آخر ہم جتنا بھی لڑیں، جھگڑیں اور آپس میں کتنے اختلافات ہوں، تھے تو ہم بھائی ہی، اور وہ بھی جڑواں بھائی، جو یک جان اور یک ہی قالب ہوتے ہیں۔

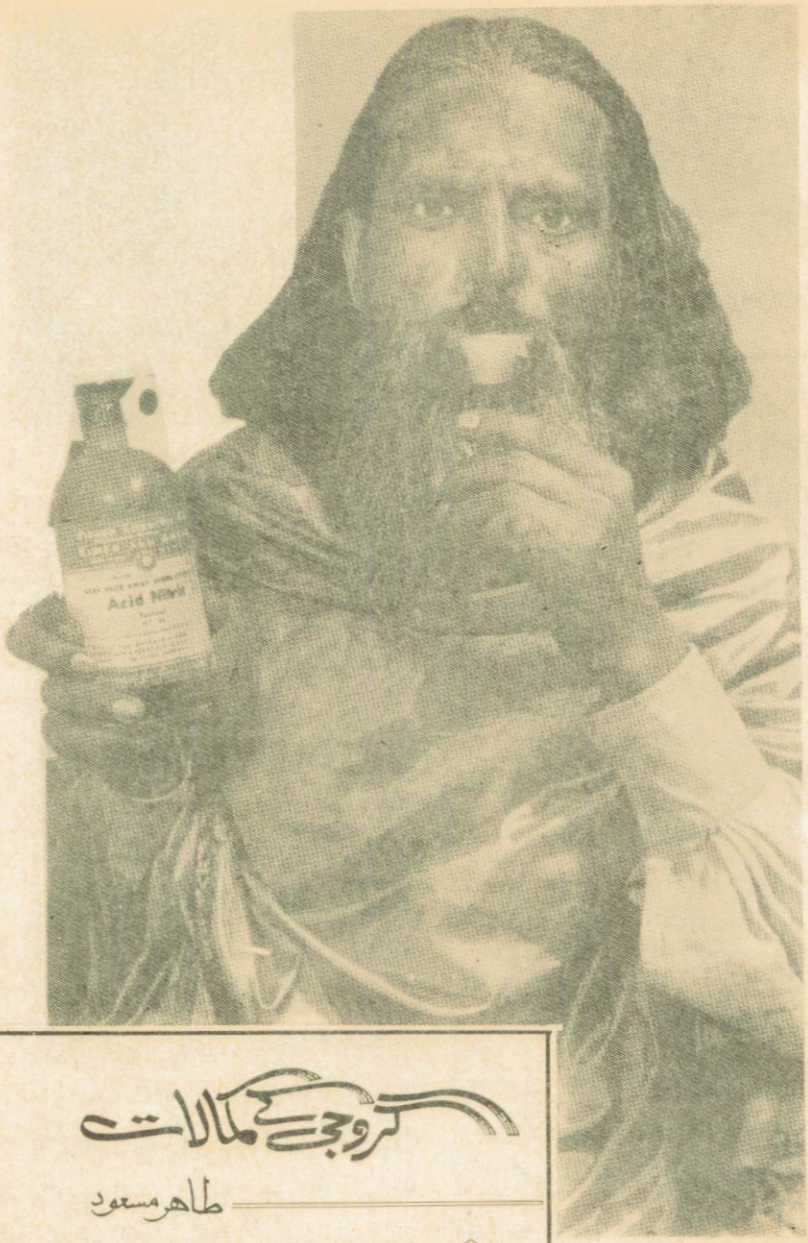

تیزاب پیتے ہوئے۔

کروچے کے کمالات

طاہر مسعود

ریکارڈ پلیئر چباتے ہوئے۔

فرض کیجئے آپ گھر پہ اکیلے ہیں، سب لوگ کہیں گئے ہوئے ہیں، رات گئے اچانک آپ کی آنکھ کھل جاتی ہے اور شدید بھوک محسوس ہوتی ہے۔ باورچی خانے میں کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے، دکانیں بند پڑی ہیں اور پڑوسیوں کو جگانا بھی ممکن نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ کیا کریں گے۔ اگر کوئی کہے کہ آپ بھوک مٹانے کے لئے اپنی کرسی چبا ڈالیں، یا گلاس توڑ کر کھا جائیں۔ تو آپ ایسا مشورہ دینے والے کو پاگل ہی کہیں گے۔ کیوں؟ اس لئے کہ کرسی کوئی پاپڑ یا بسکٹ تو ہے نہیں کہ اسے کھایا جاسکے اور نہ گلاس کوئی پھل فروٹ ہے کہ اس سے پیٹ بھرا جاسکے۔ لیکن جناب..... اللہ میاں کی اس دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ انسان نے اکثر ناممکن چیزوں کو ممکن بنا دیا ہے۔ ہندوستان کے شہر کلکتہ میں ایک ایسے ہی گرو جی رہتے ہیں جن کی پسندیدہ غذائیں میز، ریکارڈ پلیئر، شیشے کا گلاس اور ایسی ہی دوسری چیزیں ہیں جبکہ مشروبات مثلاً مرغوب مشروب تیزاب کا شورہ ہے جسے وہ غٹاغٹ پی جاتے ہیں۔ لیجئے آپ تو مسکرانے لگے۔ بھئی اس میں ہنسنے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ان تصویروں کو غور سے دیکھئے آپ کو یقین آجائے گا۔

ان گرو جی کا پورا نام ہے سوامی مارجدلامبا۔ اور ان کی شہرت ہی لکڑ ہضم پتھر ہضم کی وجہ سے ہے۔ ان کے سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے ہیں اس کے باوجود وہ ایسی تمام چیزیں مزے سے کھا پی جاتے ہیں۔ جن کے بارے میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کسی گھوڑے کی طرح مضبوط جسم کے مالک ہیں۔ ایک مرتبہ ڈاکٹروں نے ان کا طبی معائنہ کیا اور انہیں مشورہ دیا کہ ویسے تو آپ ہر لحاظ سے ٹھیک ٹھاک ہیں اور آپ کو کوئی بیماری وغیرہ نہیں ہے اس کے باوجود ہمارا مشورہ ہے کہ آپ اپنی غذا کو بہتر بنائیں ورنہ آپ مارے جائیں گے۔ گرو جی یہ سن کے مسکرائے اور بولے۔ "بے چارے ڈاکٹروں کے دماغ میں تو ہر وقت شک و شبہ بھرا رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی آدمی کے معدے میں تیزاب کے چند قطرے بھی چلے جائیں تو اس کی فوراً موت واقع ہوجائے گی۔ اور ایک میں ہوں کہ روزانہ ڈیڑھ پاؤ تیزاب پی جاتا ہوں اور پھر بھی صحت مند رہتا ہوں۔" گرو جی کی باتیں سننے والے حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

پہلی بار جب گرو جی نے تیزاب پینے کا مظاہرہ کیا تو ایک عجیب ہی منظر تھا۔ لوگ ان کی خوشامد کر رہے تھے کہ وہ خود کشی کی کوشش نہ کریں لیکن گرو جی کے الفاظ میں "میں نے ان لوگوں کو دکھا دیا کہ انسانی ارادہ اور یقین کسی بھی تیزاب سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔" انہوں نے اپنے تجربے کے بارے میں بتایا کہ میں نے تیزاب کا بڑا گھونٹ لیا اور دعا کی۔ تیزاب جیسے ہی میرے گلے سے پیٹ میں اترا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک میرا پیٹ گرم رہا۔ لیکن اس کے بعد مجھے لگا کہ میں نے زندگی میں آج تک اپنے آپ کو اتنا بہتر محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ لذارات کے کھانے کے بعد میں نے تیزاب کا ایک گلاس پھر پیا۔ اور تب سے آج تک یہی معمول ہے۔

لیکن دوستو..... اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ

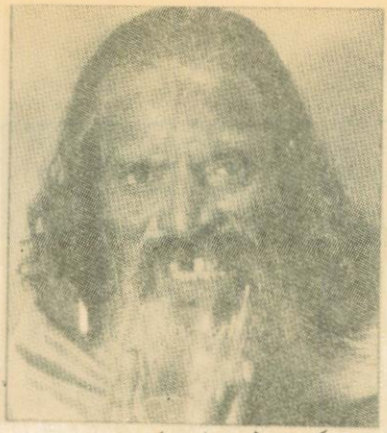

گرو جی شیشے کا گلاس کھاتے ہوئے۔

یہ تجربہ آپ بھی اپنے اوپر کرنے کی کوشش کریں..... گرو جی یہ بھی تو کہتے ہیں کہ "میں ہر ایک کو تیزاب پینے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ یہ تو میرا مشغلہ اور میرا کام ہے..... اور جس کا کام اسی کو ساجھے!

بچوں نے اپنے پاؤں میں پہیے لگا لئے

سامنے رنگین صفحے پر آپ بہت سے بچوں کو اسکیٹنگ کرتے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے۔ کیلی فورنیا کے رہنے والے یہ بچے اسکیٹنگ کے کھیل میں بڑے باکمال سمجھے جاتے ہیں بلکہ ان میں سے ایک تو "اسکیٹنگ کلینک" نامی کلب میں باقاعدہ تربیت بھی دیتا ہے۔

یہ بچے ایک ایسی ٹیم کے ممبر بھی ہیں جسے ایک بہت بڑا تجارتی ادارہ اپنے خرچ سے کھیلنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ کیلیفورنیا کی سڑکوں پر بجلی کی رفتار سے دوڑتے ہوئے یہ بچے اپنے کمال فن سے ہر راہ گیر کو حیران کر دیتے ہیں ایک بچہ تو ہر روز صبح اٹھ کر اخبار بیچنے نکلتا ہے تو پاؤں میں رولر لگا لیتا ہے اور سائیکل سے زیادہ تیز رفتاری سے اپنی منزل سر کرتا ہے۔

پہیوں پر دوڑنے پھرنے کا یہ کھیل "رولر اسکیٹنگ" کہلاتا ہے۔ ایک اسکیٹنگ برف پر بھی ہوتی ہے مگر اس میں جوتوں کے نیچے پہیے نہیں ہوتے بلکہ ایک بلیڈ ہوتا ہے۔ آپ ممکن ہے یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہے ہوں کہ امریکی بچے کیسے کیسے خطرناک کھیل کتنی مہارت سے کھیلتے ہیں۔ مگر اس میں حیرت کی کیا بات ہے یہ کھیل تو آپ بھی کھیل سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ایسے پختہ میدان، اور ایسی ہموار سڑکیں بھی تو دستیاب ہوں۔

جو سڑکیں ہمارے ہاں موجود ہیں ان پر کبھی اسکیٹنگ کی کوشش کیجئے گا بھی نہیں، ورنہ بعید نہیں کہ گلشن اقبال کے مین ہول میں گرنے کے بعد آپ ناظم آباد کے مین ہول سے باہر آئیں۔

کوئیز کہانی آئندہ ماہ سے معلوماتی مقابلے کا نیا دلچسپ سلسلہ

طویل انتظار کے بعد اب بالآخر اسامہ بن سلیم آپ کے لئے اچھوتے انداز کا کوئیز لے کر آئندہ ماہ حاضر ہو رہے ہیں۔

"کوئیز کہانی آپ کی معلومات اور آپ کی ذہانت کو کھلا چیلنج ہو گا۔"

اس سلسلہ وار مقابلے کو دسمبر کے شمارے میں پڑھنا نہ بھولیے

اسکیٹنگ

پہیے لگے پاؤں ۔ پَر لگے بچّے

بڑا مشکل ہے
فن اپنا
بہت فن کار ہیں ہم سب

گلی میں گھومتے پھرتے
سڑک پہ
دوڑ کر جاتے ہوئے
اخبار دینا
کام ہے میرا

کیلیفورنیا کا
محنت کش بچّہ
۱۳ سالہ
جم مرمبل

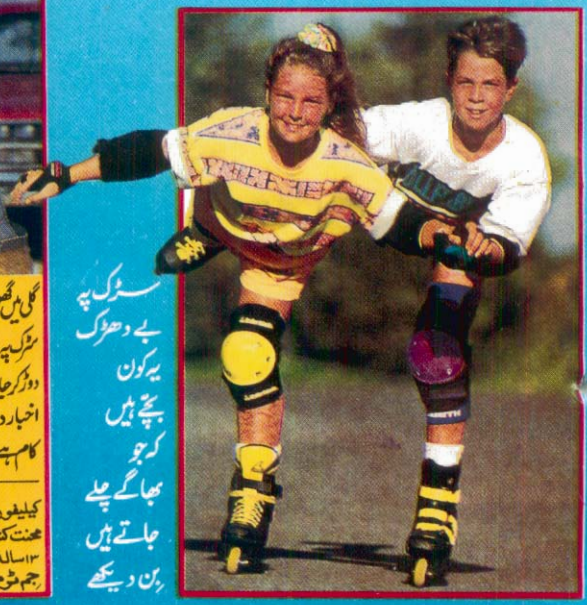

سڑک پہ
بے دھڑک
یہ کون
بچّے ہیں
کہ جو
بھاگے چلے
جاتے ہیں
بِن دیکھے

کتنا بڑا مُصوّر دیکھو میرا خدا ہے

اسامہ بن سلیم

اللہ نے اس زمیں پر کیا کیا نہ کچھ بنایا
ندّی پہاڑ دریا، پھل پھول، دھوپ سایا
اجزاء اسی ہوا کے مل کر بنے ہیں پانی
پانی سے جھیل دریا، دریاؤں میں روانی
گہرے سمندروں کو پانی کا گھر بنایا
پانی کے گھر کو اپنی تخلیق سے سجایا
قوسِ قزح کے رنگ سے جو مچھلیاں بنی ہیں
کتنی یہ پُرکشش ہیں اور کس قدر حسیں ہیں
رنگین پیرہن میں، "دم" "اُس" کا بھر رہی ہیں
اپنے خدا کی مدحت اس طرح کر رہی ہیں
قدرت کے رنگ میں بھی ہر رنگ جُدا جُدا ہے
کتنا بڑا مصوّر دیکھو میرا خُدا ہے

پاکستانی غذائی مچھلیاں

حماد احمد ہاشمی

ساتھیو! جہاں پاکستان کو خدا تعالیٰ نے ہمہ قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ وہاں پاکستان میں غذائی مچھلیاں بھی ساحلی اور دریائی علاقوں میں بہتات کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ جنہیں لوگ بڑے شوق سے کھاتے ہیں اور تفریح کے طور پر ان کا شکار بھی کیا جاتا ہے۔ آج ہم آپ کو چند مشہور علاقائی مچھلیوں کے بارے میں بتائیں گے۔

۱۔ پلّا۔ اس کو عام زبان میں تکی پلوار بھی کہتے ہیں۔ یہ سندھ کی مشہور مچھلی ہے اور یہ نہایت مزیدار ہوتی ہے۔ حلانکہ یہ کانٹوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ لیکن سندھ میں جس طریقے سے یہ کھائی اور پکائی جاتی ہے وہ منفرد ہے۔ ایک مثل مشہور ہے کہ "جو کوئی بھی پلا مچھلی کھاتا ہے۔ وہ سندھ کبھی نہیں چھوڑتا"

۲۔ رِپّل۔ اس کو منگرا، کموٹ اور سوراپی پشک اپنے اپنے علاقوں کی زبان میں کہتے ہیں۔ یہ چھوٹی لیکن لمبی ہوتی ہے۔ اس کا رنگ آسمانی بھورا ہوتا

ہے اور یہ شارک مچھلی ساحلی علاقوں میں ۵۰ میٹر تک کی گہرائی تک پائی جاتی ہے۔ یہ بھی ایک مزیدار مچھلی ہے۔

سرام ۔ یہ ایک بڑی مچھلی ہے۔ جو عام طور پر چار فٹ لمبی ہوتی ہے اور نہایت لذیذ مچھلی ہے۔ ساحلی علاقوں پر بڑی تعداد میں پکڑی جاتی ہے۔ یہ

مچھلی سری لنکا بر آمد بھی کی جاتی ہے۔ اس کے جسم پر پانچ چھ کالے دھبے اسے دوسری مچھلیوں سے مختلف بتاتے ہیں۔

۴۔ بلوچ ۔ عام زبان میں مقامی لوگ اسے کالا پیلپٹ کہتے ہیں۔ بیضوی شکل کی پچکی ہوئی یہ مچھلی جس کا منہ چھوٹا ہوتا ہے عام طور پر معتدل گرم موسم میں بڑی تعداد میں پکڑی جاتی ہے۔ عام طور پر اس کا رنگ بھورا ہوتا ہے اور اس

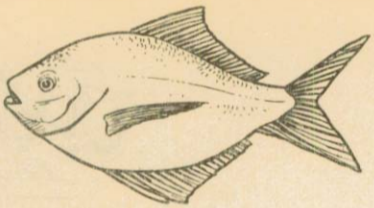

کا سائز عموماً ڈیڑھ فٹ ہوتا ہے اور لوگ اسے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

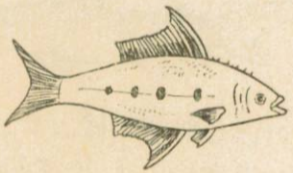

۵۔ سونان ۔ عام طور پر سنہرے اور چاندی رنگ کی مچھلی گرم پانیوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن بعض اوقات ساحلی اور پہاڑی علاقوں کے پانیوں میں بھی ملتی ہے۔ دیکھنے میں خوبصورت اور کھانے میں نہایت لذیذ مچھلی ہے۔

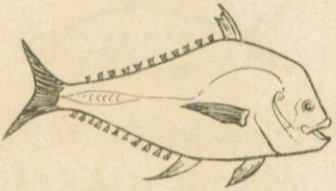

۶۔ پٹّل ۔ اسے عام طور پر رپل بھی کہتے ہیں۔ عام اس کا رنگ مٹیلا سبز یا چاندی کا ہوتا ہے۔ عموماً ۲ فٹ لمبی ہوتی ہے۔ ساحلی علاقوں پر بڑی تعداد میں پکڑی جاتی ہے۔ کھانے میں بڑی لذیذ ہوتی ہے۔

۷۔ مشکا ۔ عام طور پر یہ مچھلی آسمانی اور نارنجی رنگ کی ہوتی ہے۔ عموماً دو فٹ تک لمبی ہوتی ہے۔ یہ عام طور پر مخصوص ڈرم کی آواز نکالتی ہے۔ ان کی بعض اقسام چاندی رنگ کی بھی ہوتی ہیں۔

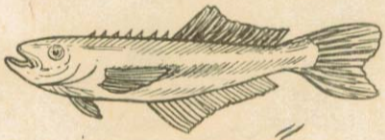

۸۔ سنگھاڑا ۔ اس کو عام طور پر سنگلور یا کوبیا بھی کہتے ہیں۔ جسم لمبا اور سگار کی مانند ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر بھورے سفید رنگ کی ہوتی ہے۔ اور عموماً ۴ فٹ لمبی ہوتی ہے۔ سردیوں کے موسم میں پکڑی جانے والی یہ مچھلی بہت ہی لذیذ اور مشہور ہے۔

ایک سردار جی اپنے بیٹے کے ساتھ جنگل میں لکڑیاں کاٹنے گئے جب شام کو دونوں واپس جانے لگے تو راستہ بھول گئے۔ بہت تلاش کیا مگر راستہ نہ ملا، آخر تھک ہار کے سردار جی اپنے بیٹے کو پیٹنے لگے اور کہا کہ "کم بخت تو، تو گھر جا تیری ماں تیرا انتظار کر رہی ہوگی۔ راستہ تو میں بھولا ہوں۔"

شازیہ غفار...... کراچی

اِن پر اعتماد کیجیے

اِن سے تعاون کیجیے

وطنِ عزیز کے قریے قریے
اور نگر نگر
ہر ماہ باقاعدگی سے

آنکھ مچولی

پہنچانے کے لیے ہم نے

اِن اداروں کو
اپنا باقاعدہ ایجنٹ
مقرر کیا ہے

محمد حسین برادرز	کراچی	۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد	راولپنڈی	۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدرآباد	۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان	۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۶۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ	۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
سلمان برادرز	نوابشاہ	۲۴۱۴
سعید بک سٹال	گجرات	۲۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈز بکسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
کھٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
رحمت بکسٹال	اوکاڑہ	
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ	
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	

آنکھ مچولی خریدنے کے لیے
اپنی تجاویز اور مشوروں کے لیے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

خط و کتابت کے لیے

ماہ نامہ **آنکھ مچولی** - ڈی ۱۱۲ - سائٹ • کراچی ۱۶

بوڑھے آدمی کی فریاد

عبدالحفیظ ظفر

مجھے آج تم کیوں ستاتے ہو بچّو میرا کس لئے دل دکھاتے ہو بچّو

مجھے تنگ کر کے بھلا کیا ملے گا نجانے تمہیں لطف کیسا ملے گا

مرا صبر کیوں آزماتے ہو بچّو مجھے آج تم کیوں ستاتے ہو بچّو

ستانے سے پہلے یہ سوچو خدارا کہ میں ہوں جہاں میں مصیبت کا مارا

پریشان بس اس لئے زندگی ہے مری بدنصیبی مری بے بسی ہے

مگر تم تمسخر اڑاتے ہو بچّو مجھے آج تم کیوں ستاتے ہو بچّو

سنو بات سچی بتانے لگا ہوں تمہیں ٹھیک رستہ دکھانے لگا ہوں

تمہیں بھی بڑھاپا ستائے گا اک دن کوئی یوں تمہیں بھی رلائے گا اک دن

حقیقت یہ کیوں بھول جاتے ہو بچّو مجھے آج تم کیوں ستاتے ہو بچّو

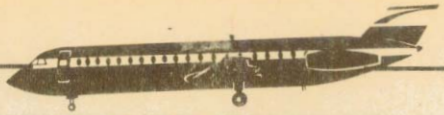

دورانِ پرواز ایک چھوٹے طیارے کا ایک انجن خراب ہو گیا جہاز میں پائلٹ کے علاوہ تین افراد سوار تھے اور جہاز کا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ "آپ تینوں میں سے ایک کو جہاز سے کود کر موت کو گلے لگانا ہو گا بصورتِ دیگر ہم چاروں مریں گے۔" پائلٹ نے کہا۔

جہاز میں دو افراد گورے اور ایک نیگرو تھا۔ طے یہ ہوا کہ ہر ایک سے معلوماتِ عامہ کا ایک سوال پوچھا جائے گا۔ اور جو شخص اس کا جواب نہ دے سکے گا اسے چھلانگ لگانی ہو گی۔

"لیکن سوال ایک ہی موضوع سے متعلق ہو گا۔" نیگرو نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے" سب نے اتفاق کرتے ہوئے کہا اور طے یہ پایا کہ سوال پائلٹ کرے گا۔

پائلٹ نے پہلے شخص سے جو ایک پروفیسر تھا پوچھا "دنیا کا سب سے بڑا بحری حادثہ کون سا تھا؟"

"ٹائی ٹینک نامی بحری جہاز کی غرقابی کو ہم سب سے بڑا بحری حادثہ کہہ سکتے ہیں۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" پائلٹ نے کہا اور دوسرے شخص کی طرف مڑ کر پوچھا "اس حادثہ میں کتنے افراد ہلاک ہوئے۔"

"پندرہ سو۔" دوسرے فرد نے جواب دیا۔

"بالکل صحیح جواب ہے۔" پائلٹ نے کہا اور پھر نیگرو کی طرف گھوم کر بولا۔ "ٹھیک ہے مسٹر اب تمہاری باری ہے اور تم اس حادثے میں ہلاک ہونے والوں کے نام بتاؤ؟"

آنکھ مچولی البم

چوزے کی تخلیق۔ گوریلے کا غور و خوض۔

انڈے شتر مرغ کے، مزے گڈو میاں کے۔

ہم نے تو پہلے ہی برش کر لیا ہے

دنیا کا سب سے مشکل کوئز آسان

یہ کوئیز جناب عقیل عباس جعفری نے مرتّب کیا ہے۔ ان کا نام آنکھ مچولی پڑھنے والوں کے لئے نیا نہیں۔ اس سے پہلے آنکھ مچولی میں ان کے تین سلسلے (مشاغل کی کہانی، دائرۂ معلومات اور گنی چنی معلومات) اور متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

مرتّب کا دعویٰ ہے کہ ان کا ترتیب دیا ہوا کوئیز دنیا کا مشکل ترین کوئیز ہے، اور آنکھ مچولی پڑھنے والا کوئی بچہ ان تمام سوالات کے صحیح جوابات نہیں دے سکتا۔ جب کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ دنیا کا آسان ترین کوئیز ہے اور آنکھ مچولی پڑھنے والا ہر بچہ ان تمام سوالات کے صحیح جوابات جانتا ہو گا۔

آپ ان تمام سوالوں کے جوابات ایک سادے کاغذ پر تحریر کر لیجئے۔ اور انہیں صفحہ نمبر ۵۵ پر دیئے ہوئے جوابات سے ملایئے۔ دیکھتے ہیں کس کی رائے درست ہے..... (ادارہ)

۱..... قرآن پاک میں کُل کتنے رکوع ہیں ؟

۲..... قطب مینار کا نام کس شخصیت کے نام پر قطب مینار رکھا گیا ہے ؟

۳..... قرار دادِ پاکستان کس تاریخ کو منظور ہوئی تھی ؟

۴..... بجلی کا بلب کس نے ایجاد کیا تھا ؟

۵..... کرۂ ارض کا بلند ترین پہاڑ کون سا ہے ؟

۶..... ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہفتہ کا کونسا دن تھا ؟

۷..... جارج بش امریکہ کے اکتالیسویں صدر ہیں۔ بتایئے انہیں شامل کرتے ہوئے اب تک کتنے افراد امریکہ کے عہدۂ صدارت پر فائز ہو چکے ہیں ؟

۸..... یہ شعر کس کا ہے

اسلام کے دامن میں اور اس کے سوا کیا ہے؟
اک ضربِ ید اللہی، اک سجدۂ شبیری

پیٹو

عادل منہاج

اس دن میں گھر میں اکیلا تھا۔ سب لوگ کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے اور مجھے گھر کی چوکیداری کے لئے چھوڑ گئے تھے۔ کرنے کے لئے کوئی کام بھی نہیں تھا اس لئے بوریت ہو رہی تھی کہ اچانک دروازے کی گھنٹی بج اٹھی جا کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ باہر ایک پہلوان نما شخص کھڑے تھے۔ سر پر پگڑی بندھی ہوئی تھی ناک پر عینک رکھی تھی جس کا ایک شیشہ غائب تھا۔ ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولے، "ارے بھئی تم کون ہو؟ ذرا جا کر ملک صاحب کو بلاؤ کہ ان کا جگری یار آیا ہے۔" ملک صاحب میرے ابا جان کا نام تھا۔

"جی..... وہ تو کسی تقریب میں گئے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہائیں! میں تو اتنی دور سے ملنے آیا تھا اور وہ گھر میں ہی نہیں ہے۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"آپ اندر تشریف لائیے۔" میں نے اخلاقاً کہا۔

"ظاہر ہے اب اندر بھی تشریف لاؤں گا۔" وہ بولے اور کمرے میں داخل ہوتے ہی کرسی پر دھم سے گرے۔ جیسے بہت تھک گئے ہوں۔

"ارر ....." میں نے کہنا چاہا مگر وہ کرسی سمیت فرش پر لڑھک چکے تھے۔ دراصل کرسی کا ایک پایہ غائب تھا بے وقوف! کرسی کا پایہ تک نہیں اور اسے سامنے سجا کر رکھا ہوا ہے۔" وہ فرش پر لیٹے لیٹے دھاڑے۔

"مم۔ میں معافی چاہتا ہوں جناب!" میں نے بوکھلا کر کہا۔ "اب مجھے اٹھاؤ بھی!" وہ چیخے میں نے جلدی سے ان کا بازو پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے پوری قوت سے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھنا چاہا۔ وہ تو اٹھ گئے لیکن ان کے بوجھ سے میں چاروں شانے چت نیچے پڑا تھا۔ "ارے بھئی! اب تمہیں کیا ہوا؟" وہ حیران ہو کر بولے۔

"جو آپ کو ہوا تھا۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ اور کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ مہربانی فرما کر صوفے پر بیٹھیں اور بیٹھنے سے پہلے صوفے کے پائے کو چیک بھی کر لیں۔ میں آپ کے لئے کچھ لاتا ہوں۔" میں نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ جب میں شربت لے کر واپس لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ فرش پر ایک عدد چھپکلی کا پیچھا کر رہے ہیں اور ہاتھوں میں چپل سنبھال رکھی ہے۔ اور کہتے جا رہے ہیں۔ "اچھا تو تم باز نہیں آؤ گی ٹھہرو، میں تمہیں ابھی بتاتا ہوں۔" چھپکلی تیزی سے رینگتی ہوئی الماری کے پیچھے چھپ گئی اور وہ بے نیل و مرام مڑے۔ اس وقت ان کے چہرے پر ایسی مایوسی تھی جیسے ہاتھ آئے دشمن کے بچ نکل جانے پر ہوتی ہے۔ میں سکون کا سانس لے کر اندر داخل ہوا اور ٹرے میز پر رکھ کر گلاس میں شربت انڈیلنے لگا۔ اچانک وہ جھپٹے اور جگ میرے ہاتھوں سے لے کر گلاس کا شربت واپس اس میں انڈیل دیا اور جگ منہ سے لگا لیا اور جب جگ ان کے منہ سے الگ ہوا تو وہ خالی ہو چکا تھا۔ "بھئی اتنے سے شربت سے تو ایک داڑھ بھی تر نہیں ہوئی۔" انہوں نے منہ بنایا۔

"کک ..... کیا فرمایا داڑھ تر نہیں ہوئی۔ اتنے شربت سے تو میں غسل کر سکتا ہوں" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"میاں۔ ہم پرانے وقتوں کے لوگ ہیں۔ ہم تو ایک وقت میں پوری بالٹی لسی کی پی جاتے ہیں۔ یہ شربت کیا چیز ہے۔" انہوں نے فخر سے کہا۔ "اچھا تو اب معلوم ہوا کہ دودھ میں ملاوٹ کیوں شروع ہوئی" میں نے آہستہ سے کہا۔ "خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ کھانے کو کچھ ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"جی دیکھتا ہوں۔" میں نے منہ بنایا اور باورچی خانے کا رخ کیا۔ رات کے کھانے میں گوشت بچا ہوا تھا اور امی جانے سے پہلے روٹیاں پکا کر گئی تھیں۔ میں نے ڈونگے میں گوشت نکالا اور روٹیاں وغیرہ

لے کر ان کے پاس پہنچا۔ میں نے پلیٹ میں سالن ڈالنے کے لئے چمچے کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن انہوں، نے میرا ہاتھ پرے جھٹک دیا اور ڈونگا اپنی جانب کھینچ لیا۔ پھر روٹیاں اٹھائیں اور انہیں توڑ توڑ کر ڈونگے میں موجود سالن میں ڈال لیا۔ تمام روٹیاں اس میں ڈالنے کے بعد وہ چمچے کے ذریعے کھانے لگے۔ مجھ سے یہ منظر نہ دیکھا گیا لہٰذا اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جب آنکھیں کھولیں تو ڈونگا خالی پڑا تھا اور انہوں نے پانی کا جگ منہ سے لگا رکھا تھا۔ آخر جگ خالی کر کے رکھ دیا اور ایک خوفناک ڈکار لے کر بولے۔ "لو بھئی، پیٹ کی ایک نکڑ تو پُر ہو گئی۔"

"کیا فرمایا؟ ایک نکڑ۔" میں نے بوکھلا کر کہا کیوں کہ وہ پانچ چھ روٹیاں کھا چکے تھے۔

"تو اور کیا بھئی، میں عام طور پر کھانے میں دس بارہ روٹیاں کھاتا ہوں۔" وہ بولے۔ "اس کا اندازہ تو مجھے ہو رہا ہے۔" میں نے آہ بھری کیوں کہ اب میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے اور آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔

"بھئی کھانے کے بعد کوئی سوئٹ ڈش بھی تو ہونی چاہئے۔" انہوں نے کہا۔ "سوئٹ ڈیش؟" میری تو آنکھیں باہر نکل آئیں۔ "ابھی حاضر کرتا ہوں۔" میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے باورچی خانے کا رخ کیا! فرج سے دودھ نکالا اس میں کھیر مکس کا پاؤڈر گھولا اور ساتھ ہی اس میں ڈھیر ساری سرخ سرخ مرچیں بھی ملا دیں۔ جب سوئٹ ڈش تیار ہو گئی تو ایک بڑے سے ڈونگے میں نکالی پھر اس پر میوہ وغیرہ ڈال دیا اور ڈونگا لے کر کمرے میں داخل ہوا تو دھک سے رہ گیا۔ کمرے میں موجود الماری کھلی پڑی تھی اور انہوں نے الماری سے بسکٹ کے ڈبے نکال رکھے تھے۔ اور دونوں بھرے ڈبے اب میز پر خالی پڑے تھے۔ میرے ہاتھوں میں ڈونگا دیکھ کر بے تابی سے لپکے لیکن قریب آ کر ان کی نظر کھیر پر پڑی تو بولے "بس اتنی سی" "آپ کھائیے تو سہی۔ اتنی ایک بار پھر کھائیں گے اور آئندہ کھانے کا نام نہ لیں گے۔" آخری جملہ میں نے دل میں کہا۔ انہوں نے بڑے چمچے سے کھیر نکالی اور منہ میں ڈال لی۔ میں منتظر تھا کہ اب وہ "سی سی" کرتے ہوئے کمرے میں دوڑ بھاگ مچائیں گے۔ لیکن میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ بڑے مزے سے کھیر کھا رہے تھے اور تھوڑی دیر میں کھیر ختم ہو چکی تھی کھیر ختم کر کے انہوں نے انگڑائی لی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "بھئی تمہارا منہ کیوں کھلا ہوا ہے۔ کیا کوئی مکھی وغیرہ گھس گئی ہے۔" میں نے جلدی سے منہ بند کر لیا۔ "جج.....جی نہیں! کھیر کیسی تھی؟" میں نے حیرت سے پوچھا

"بھئی بہت مزیدار تھی میں نے پہلی مرتبہ اتنی بہترین سوئٹ ڈش کھائی ہے۔ بھئی واہ ملک کا بیٹا بھی اس کی طرح مہمان نواز ہے۔" وہ خوش ہو کر بولے۔ میں نے آہ بھری اور خالی ڈش اٹھائی اور جا کر رکھ آیا۔ وہ بھی سوچ میں گم بیٹھے تھے آخر میں بولا۔ "آج بہت گرمی ہے۔" لیکن ان کے کان پر جوں بھی نہ رینگی میں سمجھا شاید انہوں نے سنا ہی نہیں اس لئے کہا "آج موسم بہت اچھا ہے۔" انہوں نے گھور کر مجھے دیکھا اور بولے۔ "تمہارے دماغ میں گرمی تو نہیں چڑھ گئی اتنی گرمی میں موسم کو اچھا کہہ رہے ہو۔ چپ چاپ بیٹے رہو۔ مجھے سوچنے دو۔"

"مم..... مگر آپ سوچ کیا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا "سوچ رہا ہوں کہ پیٹ کی آگ کیسے بجھاؤں۔ کم بخت بھرا ہی نہیں۔ یہ سن کر میں تو بوکھلا اٹھا۔ کچھ اور کھانے کو نہیں ہو گا؟ انہوں نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

"جی۔ اب تو صرف میں باقی بچا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا "مطلب یہ کہ آپ خود ہی باورچی خانے کی تلاشی لے لیجئے۔ آپ ابا جان کے دوست ہیں اتنا تو آپ کا حق ہے۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔" انہوں نے خوش ہو کر کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب سے پہلے انہوں نے فرج پر چھاپہ مارا۔ اور شربت کی بوتل جگ میں انڈیل دی پھر اسے ٹھنڈے پانی سے بھر کر غٹاغٹ پی گئے پھر ڈبل روٹیاں ہضم کر گئے اس کے بعد بچے کھچے پھلوں پر ہاتھ صاف کیا اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی "ارے ابا جان آ گئے!" میں دروازے کی طرف لپکا۔

"ارے ملک آ گیا جلدی بلاؤ اسے۔" وہ باورچی خانے سے نکلے۔ ابا جان میرے ساتھ آئے اور بولے "جی آپ کو مجھ سے ملنا ہے۔"

وہ صاحب گھورتے ہوئے بولے، "مجھے ملک یوسف الدین سے ملنا ہے۔"

ابا جان یہ سن کر چونکے اور بولے۔ "وہ تو گلی کے آخری مکان میں رہتے ہیں میرا نام تو ملک اعجاز الدین ہے۔"

معاف کیجئے گا جناب مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔" یہ کہہ کر انہوں نے بھرپور ڈکار لی اور اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نکل گئے۔ جاتے جاتے وہ میری طرف دیکھنا نہیں بھولے۔ جی ہاں۔ میری طرف۔ کیوں کہ اب مجھے بھوکا ہی نہیں رہنا تھا، ابا جان سے ڈانٹ بھی سننی تھی!

جوابات "دنیا کا آسان ترین کوئیز"

(۱) قرآن پاک میں رکوعات کی کل تعداد ۵۵۸ ہے۔ مگر آپ نے اکثر یہی پڑھا اور سنا ہو گا کہ قرآن پاک کے رکوعات کی تعداد ۵۴۰ ہے۔ غالباً اس مغالطے کا آغاز اس طرح ہوا کہ رمضان المبارک کے مہینے میں بالعموم ۲۷ شبوں میں قرآن پاک مکمل کر لیا جاتا ہے۔ چونکہ ہر شب پڑھی جانے والی تمام تراویح کی ۲۰ رکعتیں ہوتی ہیں، اس لئے یہ قرآن مجموعی طور پر ۵۴۰ رکعات میں مکمل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ فرض کر لیا گیا کہ قرآن میں بھی کل ۵۴۰ رکوعات ہوں گے۔ حالانکہ قرآن پاک کے رکوعات کی اصل تعداد ۵۵۸ ہے۔

(حوالہ: قرآن مجید)

(۲) قطب مینار جو کہ دہلی میں واقع ہے اور جسے ہند اسلامی فنِ تعمیر کا ایک شاہکار سمجھا جاتا ہے، سلطنت دہلی کے بانی قطب الدین ایبک اور اس کے جانشین شمس الدین التتمش نے تعمیر کروایا تھا۔ چونکہ اس مینار کی تعمیر کے ساتھ قطب الدین ایبک کا نام وابستہ تھا اس لئے غالباً یہیں سے اس مغالطے نے جنم لیا کہ اس مینار کا نام قطب الدین ایبک کے نام کی نسبت سے قطب مینار رکھا گیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس مینار کا نام "قطب مینار" حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مقدس نام پر رکھا گیا ہے۔

(حوالہ۔ اردو انسائیکلو پیڈیا مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ۔ صفحہ نمبر ۷۵۹)

(۳) عام طور پر یہی مشہور ہے کہ قرار دادِ پاکستان ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور ہوئی تھی اور اسی وجہ سے ہر سال ۲۳ مارچ کو بڑی دھوم دھام سے یومِ پاکستان بھی منایا جاتا ہے، مگر یہ بات کلی طور پر درست نہیں۔

مسلم لیگ کا وہ تاریخی اجلاس جس میں قرار داد پاکستان منظور ہوئی مسلم لیگ کا ۲۷ واں سالانہ اجلاس تھا۔ یہ اجلاس ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو بعد نماز جمعہ شروع ہوا۔ پہلے دن قائد اعظم نے اپنا فی البدیہہ صدارتی خطبہ دیا اور اگلے دن ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو شیر بنگال مولوی ابو القاسم فضل حق نے وہ تاریخی قرار داد پیش کی جو بعد ازاں قرار دادِ پاکستان کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس قرار داد کی تائید چوہدری خلیق الزماں نے کی اور مولانا ظفر علی خان، سردار اورنگ زیب خان اور سر عبداللہ ہارون نے اس کی حمایت میں تقریریں کیں۔

اجلاس کے تیسرے دن یعنی ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو صبح کے سیشن میں نواب محمد اسماعیل آف بہار، قاضی عیسیٰ، عبدالحمید خان آف مدراس، آئی آئی چندریگر، سید عبدالرؤف شاہ اور ڈاکٹر محمد عالم نے اور رات کے سیشن میں سید ذاکر علی، بیگم محمد علی اور مولانا عبدالحامد بدایونی نے قرار داد کی حمایت میں تقریریں کیں۔ مولانا عبدالحامد بدایونی کی تقریر کے بعد قائد اعظم نے قرار داد پر رائے شماری کروائی تمام مندوبین نے متفقہ طور پر قرار داد کی حمایت کی اور قرار داد منظور کر لی گئی۔

یعنی جس دن قرار داد پاکستان پیش ہوئی اس دن ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی تاریخ تھی، اور جس دن یہ قرار داد منظور کی گئی تھی اس دن ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کی تاریخ تھی۔

(حوالہ۔ اجلاس لاہور ایک جائزہ۔ تحریر۔ سید شمس الحسن، ترجمہ۔ مہر الاسلام صدیقی۔ مشمولہ۔ قرار دادِ پاکستان، تاریخ اور تجزیہ۔ خواجہ رضی حیدر صفحہ ۸۵ تا صفحہ ۹۳)

(۴) بجلی کے بلب کی ایجاد کا سہرا عموماً امریکی سائنس دان ٹامس ایلوا ایڈیسن کے سر باندھا جاتا ہے مگر بہت کم لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ بجلی کا بلب ایڈیسن کی نہیں بلکہ انگریز سائنس دان جوزف سوان کی ایجاد ہے۔

در حقیقت کرنٹ کے ذریعہ کسی تار کو گرم کرنے کا تجربہ ۱۸۳۵ء ہی میں ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۴۸ء میں جوزف سوان نے یہ تجربات کاربن پر کئے، اور اس کے مفید نتائج بر آمد ہوئے۔ ۱۸۶۵ء میں جرمن سائنس دان پرمن اسپرنگل نے مرکری ویکیوم پمپ ایجاد کیا تو اس نے جوزف سوان کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ اور اس نے دسمبر ۱۸۷۸ء میں نیو کیسل کیمیکل سوسائٹی کے سامنے اس ویکیوم پمپ میں ایک تار روشن کرنے کی کوشش کی۔ اس کی یہ کوشش ایک ماہ بعد یعنی جنوری ۱۸۷۹ء میں کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

مگر اس دوران تامس ایلوا ایڈیسن بھی انہی خطوط پر بلب ایجاد کرنے کا کام شروع کر چکا تھا۔ اور سوان کے کوئی ۹ ماہ بعد ۲۱ اکتوبر ۱۸۷۹ء کو اس نے اپنی اس ایجاد کا کامیاب مظاہرہ بھی کر ڈالا۔ ایڈیسن کا ایجاد کردہ بلب ساڑھے تین گھنٹے تک روشن رہا تھا۔

کچھ عرصے تک یہ دونوں موجدین علیحدہ علیحدہ اپنی کوششوں میں مصروف رہے، مگر ۱۸۸۴ء میں ان دونوں نے اکٹھے ہو کر کاروبار کا آغاز کیا اور بلب بنانے کی ایک فیکٹری قائم کی۔ جس نے ۱۵ ماہ میں ۸۰ ہزار کے لگ بھگ بلب تیار کئے۔ اور یوں یہ دونوں موجدین دولت سے مالا مال ہو گئے۔

حوالہ۔
(1) Facts & Fallacies by Rohd & Leda, Bhimburg. Page 78
(2) Don,t you believe it– by Graham Nuwn. Page 33

(۵) جزائر ہوائی میں واقع کوہ کوانا کیا (Kauna Kea) کرۂ ارض کا بلند ترین پہاڑ ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ماؤنٹ ایورسٹ کے برعکس اس پہاڑ کا نصف سے زائد حصہ سمندر کے اندر ہے یہ پہاڑ مجموعی طور پر ۹۰۷۸ میٹر بلند ہے، جس میں سے ۴۸۷۷ میٹر سمندر کے اندر واقع ہے اور ۴۲۰۱ میٹر سطح سمندر کے اوپر۔ جبکہ اس کے برعکس ماؤنٹ ایورسٹ، جو کوہ کوانا کیا سے ۲۳۰ میٹر چھوٹا ہے، مکمل طور پر سطح ارض کے اوپر ہے۔ یوں ماؤنٹ ایورسٹ جس کی بلندی ۸۸۴۸ میٹر ہے، سطح ارض کا بلند ترین پہاڑ ہو سکتا ہے مگر کرۂ ارض کا بلند ترین پہاڑ "کوہ کوانا کیا" ہے۔ جس کی مجموعی اونچائی ۹۰۷۸ میٹر ہے۔

(1) Facts and Fallacies by Rohda and Lada Blumberg. rage 121 حوالہ

(۶) عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء بمطابق ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کو معرض وجود میں آیا اور اس دن جمعۃ الوداع تھا۔ مگر یہ درست نہیں۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اسلامی تاریخ تو یقیناً ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ ہجری ہی تھی، مگر اس دن جمعۃ الوداع کا دن نہیں بلکہ جمعرات کا دن تھا۔

اس مغالطے کا آغاز شاید اس لئے ہوا کہ اگرچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انتقال اقتدار کی تقریب ۱۴ اگست ۴۷ کو سہ پہر کے وقت انجام دی تھی لیکن پاکستان کے تمام ریڈیو اسٹیشن اپنی نشریات کے اختتام یعنی ۱۱ بجے تک یہی اعلان کر رہے تھے کہ یہ آل انڈیا ریڈیو ہے۔ رات ۱۱ بج کر ۵۰ منٹ پر لاہور کے ریڈیو اسٹیشن نے اپنی نشریات کا دوبارہ آغاز کیا۔ پہلے اعلان ہوا "یہ آل انڈیا ریڈیو ہے"۔ پھر ریڈیو پاکستان کا عارضی ابتدائی نغمہ جسے خواجہ خورشید انور نے مرتب کیا تھا نشر ہوا۔ ۱۱ بجکر ۵۹ منٹ پر ریڈیو سے اعلان ہوا۔ "آدھی رات کے وقت پاکستان کی آزاد اور خود مختار حکومت وجود میں آئے گی۔" انگریزی میں اس اعلان کو جناب ظہور آذر اور اردو میں جناب مصطفیٰ علی ہمدانی نے نشر کیا۔

اس کے بعد دیواری گھڑی کی زور زور سے ٹک ٹک کی آواز آئی اور جب ٹھیک ۱۲ بج گئے تو ہزاروں سامعین نے پہلے انگریزی میں اور پھر اردو میں یہ الفاظ سنے "یہ پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس ہے۔" یہ اعلان بھی علی الترتیب جناب ظہور آذر اور جناب مصطفیٰ علی ہمدانی نے نشر کیا۔

چونکہ یہ اعلان پاکستان کے قیام کا باقاعدہ اعلان تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ مغالطہ کہ پاکستان جمعۃ الوداع کے دن معرض وجود میں آیا، شروع ہوا۔ چونکہ جس وقت یہ اعلان نشر ہوا اس وقت ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ اور جمعۃ الوداع کے دن کا آغاز ہو چکا تھا۔

لیکن یہ بات بہرحال طے ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو، یعنی جس دن انتقال اقتدار کی تقریب منعقد ہوئی، ..... جمعۃ الوداع کا دن نہیں بلکہ جمعرات کا دن تھا۔

حوالہ۔ (۱) تقویم تاریخی۔ عبدالقدوس ہاشمی صفحہ ۳۴۲،
(۲) قیام پاکستان کا پہلا نشری اعلان از حامد جلال
مشمولہ ماہ نو۔ قائدِ اعظم نمبر۔ نومبر دسمبر ۱۹۷۶ء

(۷) امریکہ کے اکتالیسویں صدر جارج بش کو شامل کرتے ہوئے اب تک جو افراد امریکہ کے عہدۂ صدارت پر فائز ہو چکے ہیں ان کی تعداد چالیس ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ گروور کلیولینڈ جو امریکہ کے ۲۲ ویں اور ۲۴ ویں صدر تھے اس طرح دو مرتبہ صدر منتخب ہوئے تھے کہ ان کی دونوں معیادوں کے درمیان ایک اور صدر جناب بنجمن ہیریسن امریکہ

کے ۲۳ ویں صدر منتخب ہوگئے تھے اس طرح گرور کلیو لینڈ کو دو مرتبہ امریکہ کا صدر تسلیم کیا جاتا ہے۔

امریکہ کے کئی صدر ۲ یا ۲ سے زیادہ مرتبہ امریکہ کے صدر منتخب ہوئے، مگر چونکہ ان کی معیادوں میں کوئی وقفہ نہیں آیا تھا، اس لئے وہ ایک ایک مرتبہ ہی صدر تسلیم کئے گئے۔ یعنی امریکی صدور کے تسلسل میں انہیں ایک ہی مرتبہ صدر مانا گیا۔ مگر چونکہ کلیو لینڈ کی معیادوں کے درمیان، ۴ سال کا ایک وقفہ آگیا تھا، اس لئے انہیں دو مرتبہ صدر تسلیم کیا گیا۔

چنانچہ امریکہ کے اکتالیسویں صدر جارج بش، اس عہدے پر فائز ہونے والے چالیسویں شخص ہیں۔ حوالہ:۔ (Readers Digest, Almanac and Year Book.)

(۸) یہ شعر علامہ اقبال کا نہیں بلکہ جناب وقار انبالوی کا ہے۔

جناب سید احسن عمرانی اپنی کتاب "اقبال در مدح محمدؐ و آل محمدؐ" میں لکھتے ہیں۔

یادش بخیر! مجھے یہ شعر پڑھ کر اور سن کر خیال آیا کرتا تھا کہ یہ علامہ مرحوم کا نہیں ہو سکتا۔ یار لوگوں نے زور ازوری ان سے منسوب کر رکھا ہے۔ بہر کیف جب مجھے کتاب اقبال در مدح محمدؐ و آل محمدؐ پر کام کرنے کا موقع ملا اور میں نے امعان نظر سے علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کا پورا کلام پڑھا اور اشعار کا انتخاب کیا تو مجھے یہ شعر کہیں اور کسی کتاب میں نظر نہیں آیا۔ تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ شعر جناب وقار انبالوی صاحب قبلہ کا ہے۔"

جناب سید احسن عمران نے بعد ازاں وقار انبالوی صاحب سے رابطہ کیا۔ انہوں نے اپنے جواب میں جناب احسن عمرانی کے خیال کی تائید کی اور انہیں بتایا۔

"یہ شعر اس بندۂ عاجز کا ہے..... یہ شعر میں نے ایک ہفت روزہ کے اجراء پر کہہ کر دیا تھا اور اس کی پیشانی پر مدتوں چھپتا رہا۔ پرچے کا نام "شہید" تھا، اور وہ مظفر علی شمسی کی ادارت میں شروع ہوا تھا۔"

جناب وقار انبالوی کی اس تحریر کے بعد یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ یہ شعر وقار انبالوی صاحب کا ہی ہے، نا کہ علامہ اقبال کا، جیسا کہ غلط طور پر مشہور ہے۔

(حوالہ۔ اقبال در مدح محمدؐ و آل محمدؐ مصنف سید احسن عمرانی صفحہ نمبر ۲۲۷)

جوابات آپ نے پڑھ لئے۔ اب آپ بتائیے کہ کون جیتا؟ عقیل عباس صاحب یا آپ ؟

اطلاعاً عرض ہے کہ یہ ہمارے ایک سلسلے کی پہلی قسط ہے جو آپ آنکھ مچولی کے آئندہ شماروں میں تسلسل کے ساتھ پڑھ سکیں گے۔

یہ سلسلہ آپ کو کیسا لگا۔ ؟ لکھنا نہ بھولئے ہمارے اس سلسلے کا نام ہوگا "ہے حقیقت کچھ"

تحریر : ڈوناچینی
ترجمہ : منیر احمد راشد

ان کے لئے ایک سچی کہانی
جو جانوروں کے لئے اپنے
دل میں کوئی درد نہیں رکھتے

یقین کی جیت

میں نے کھڑکی سے دیکھا تو وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ اسکول کی جانب جا رہا تھا۔ یہ جے تھا، میرا پندرہ سالہ بیٹا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ ایک بار پھر برف پوش میدانوں کی طرف نہ نکل جائے، جہاں وہ آج کل اپنے گمشدہ شکاری کتے 'کرکٹ' کی تلاش میں جاتا رہتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا وہ رکا، ذرا گھوما اور واپس چل دیا۔ اس کی چال سست اور کندھے اور گردن جھکی ہوئی تھی۔

یہ دس روز پہلے کا ذکر ہے۔ اتوار کا دن تھا۔ کرکٹ معمول کے مطابق شام کو کھیتوں میں

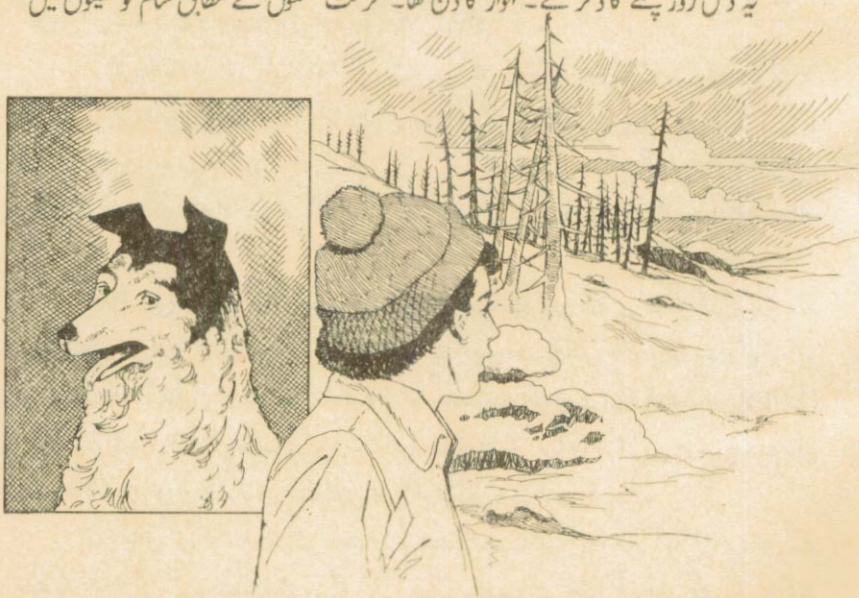

کودنے پھاندنے گیا مگر بہت دیر گزر گئی اور وہ واپس نہیں آیا۔ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ جے ساری شام اسے اردگرد کے علاقوں میں تلاش کرتا رہا مگر کرکٹ کو نہ ملنا تھا، نہ ملا۔ کرکٹ کی گمشدگی سارے گھر کے لئے اور خصوصاً جے کے لئے کسی سانحے سے کم نہیں تھی۔ وہ بہت افسردہ رہنے لگا شروع کے دنوں میں تو ہماری یہ حالت تھی کہ ہم ہر آہٹ پر چونکتے اور دروازے کی طرف دوڑ پڑتے کہ شاید کرکٹ آیا ہو مگر

ع باہر نکل کے دیکھا تو جھونکا ہوا کا تھا

آہستہ آہستہ مجھے اور میرے شوہر بل کو یہ یقین ہو گیا کہ کرکٹ کو یا تو کوئی شکاری پکڑ کر لے گیا ہے، یا پھر وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔ شاید کسی کار وغیرہ کے نیچے آ گیا ہو۔ لیکن جے نے یہ سب ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتا تھا "نہیں کرکٹ زندہ ہے، میرا دل کہتا ہے، وہ زندہ ہے اور ضرور واپس آئے گا۔"

گزشتہ شام کی بات ہے کہ میں پرندوں کے لئے ان کے برتن میں خوراک ڈالنے نکلی تو میں نے اپنے بیٹے کی آواز سنی وہ قریبی کھیتوں میں کرکٹ کو پکارتا پھر رہا تھا، اس کی آواز میں بے بسی اور کرب بہت نمایاں تھا۔ بالآخر وہ گھر لوٹ آیا۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ اور نیلی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے بڑے دکھ سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا،

"میں جانتا ہوں ممّی آپ مجھے احمق سمجھیں گی، لیکن میں مجبور ہوں۔ میں نے اللہ میاں سے بہت گڑگڑا کر دعا مانگی ہے اور میرا دل کہتا ہے، کہ میری دعا قبول ہو چکی ہے، میرا کرکٹ ضرور آئے گا وہ یہیں کہیں موجود ہے وہ ضرور آئے گا ممی ....." اس کی آواز بھرا گئی تھی اور اشک بہنے لگے تھے۔ اس نے سختی سے ہونٹوں کو بھینچ کر غم ضبط کرنے کی کوشش کی اور اندر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

حالانکہ میں اور میرا شوہر بھی باقاعدگی سے چرچ جاتے تھے لیکن مجھے حیرت تھی کہ کس چیز نے جے کا ایمان اس قدر مضبوط کر دیا تھا۔ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے اس کا یقین اتنا پختہ ہو گیا تھا شاید یہ اس کے بڑے بھائی کی موت کے صدمے کا اثر تھا۔ جے اس وقت چھ برس کا تھا جب اس کا بڑا بھائی سڑک کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ جے اس سے بہت پیار کرتا تھا اور اس کی موت پر بہت رویا تھا۔ ہو سکتا ہے اسی واقعے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ اللہ ہی سب کا مددگار ہے۔

میں چاہتی تھی کہ جے گھر میں رہے اور یہ بات سمجھ لے کہ کوئی دوسرا کتا حاصل کرنا اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں ہے لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ اسے یہ بات سمجھانا ممکن تھا۔ مجھے یاد ہے آج

سے چار سال قبل جب ہم اس کے لئے ایک سفید، سیاہ اور بھورے سارنگ کا پلا لائے تھے تو وہ کس قدر خوش ہوا تھا۔ اور پھر چند ہی دن میں دونوں ایک دوسرے سے اتنے مانوس ہوگئے کہ یک جان دو قالب کی مثال ان پر صادق آنے لگی۔ حالانکہ کرکٹ کے سونے کے لئے گیراج میں جگہ بنا دی گئی تھی لیکن تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ جے کی پائنتی میں گھسا اطمینان سے سو رہا تھا۔

تاہم اس رات میں نے جے سے کہا کہ میرا خیال ہے اب کرکٹ کی آس لگائے رکھنا بے کار ہے۔ سردی اتنی زیادہ ہے کہ اس میں کسی گمشدہ جانور کا زندہ بچنا ممکن نہیں ہے۔ جے نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور بولا۔

"یسوع مسیح کا فرمان ہے کہ ایک چڑیا بھی اللہ کے علم میں آئے بغیر نہیں گر سکتی۔ ممی آپ کا کیا خیال ہے، یہ بات کتوں پر صادق نہیں آسکتی۔"

میں لاجواب ہوگئی اور پیار سے اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

اگلے دن اسے اسکول کے لئے روانہ کرنے کے بعد میں اپنے آفس میں پہنچی۔ دفتری امور میں مشغول ہونے کی وجہ سے کتے کے بارے میں ہر بات بھول چکی تھی۔ دو بجے کا عمل ہوگا جب فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف جے تھا اس نے بتایا کہ اساتذہ کی ایک اہم میٹنگ کی وجہ سے انہیں جلدی چھٹی دے دی گئی ہے "میرا خیال ہے ممی، کیوں نہ میں کرکٹ کو تلاش کرنے کی کوشش کروں۔" جے نے کہا میرا دل دھک سے رہ گیا پھر بھی میں نے آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،

"جے، میرے بیٹے، اب اس کے لئے اپنے آپ کو اور ہلکان مت کرو۔ ریڈیو نے بتایا ہے کہ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی نیچے آگیا ہے۔ تم جانتے ہو ایسے میں....."

"لیکن ممی میں اپنے دل کا کیا کروں؟" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا "میرا دل کہتا ہے مجھے کوشش ضرور کرنی چاہئے۔" اس کے لہجے میں کوئی چیز ایسی ضرور تھی کہ جس نے مجھے چپ رہنے پر مجبور کر دیا اور مجھے اسے اجازت دیتے ہی بنی۔

مجھے فون کرنے کے بعد وہ گھر سے نکلا اور ان کھیتوں کی طرف چل دیا جہاں وہ اور کرکٹ اکثر جایا کرتے تھے۔ اس نے سفر جاری رکھا اور مشرق کی جانب تقریباً آدھے میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ تب اس نے کتوں کے بھونکنے کی آواز سنی۔ آواز خاصے فاصلے سے آرہی تھی۔ شاید یہ وہ کتے تھے جو کہیں اپنے باڑے میں بندھے ہوئے بھونک رہے تھے۔ جے نے آواز کی سمت چلنا شروع کر دیا لیکن تھوڑی دور جانے کے بعد ہی اسے احساس ہوگیا کہ وہ غلط سمت میں جارہا ہے کیونکہ اب کتوں کی آواز اور دور

سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ریلوے لائن کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے دور سے آتی ہوئی گاڑی کی آواز سنی اور یہ دیکھنے کے لئے گیا کہ آیا گاڑی کے گزرنے کے بعد ریلوے لائن گرم ہوتی ہے یا نہیں۔ گاڑی کے جانے کے بعد وہ اس پشتے پر چڑھ گیا جس کے اوپر لائن بچھائی گئی تھی اور ہاتھ لگا کر لائن کو دیکھنے لگا کہ وہ کتنی گرم ہے لیکن وہ تو برف کی مانند سرد تھی۔

وہ بے مقصد وہیں بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کا ذہن خالی تھا۔ وہ غیر شعوری طور پر لائن کے قریب پڑے ہوئے پتھروں کو ادھر ادھر کرتا رہا تب وہ اٹھا اور واپس اس طرف جانے لگا جدھر سے کتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ پشتے سے نیچے اترنے لگا۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس نے شکاری کی شارٹ گن چلنے کی آواز سنی وہ لوگ کہیں قریب ہی تھے۔ شارٹ گن کے فائر سے کچھ دیر کے لئے فضا میں گونج پیدا ہو گئی پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ ایک ہولناک سناٹا۔ جے جہاں تھا وہیں ساکت ہو گیا۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا تھا وہ کان لگائے کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا نزدیک ہی تاروں کا ایک الجھا ہوا سا جنگلہ تھا جہاں سے کسی کتے کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ جے بے تابی سے تقریباً لڑھکتا ہوا پشتے سے نیچے آیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جنگلے کے قریب جا کر اس نے کچھ خودرو جھاڑیوں کو ایک طرف ہٹایا تو اس کی نظر ایک کتے پر پڑی جو الٹا لٹک رہا تھا اس کا پچھلا بایاں پنجہ زنگ آلود جنگلے کی تاروں میں پھنسا ہوا اور اگلے پنجے بمشکل زمین کو چھو رہے تھے۔ اس کے اردگرد کی برف کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ اس کو چاٹ چاٹ کر زندہ رہا ہے۔ جے نے اسے اٹھایا اور گھر لے آیا اس نے فوراً مجھے فون کیا اس کا لہجہ بہت پُرمسرت اور پُرجوش تھا۔ اس کی بات نے مجھے چکرا دیا تھا میں فوراً گھر کی طرف دوڑی گھر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ باورچی خانے میں کرکٹ اور جے دونوں بیٹھے تھے۔ کرکٹ بہت کمزور ہو گیا تھا وہ اپنے مخصوص برتن میں اپنی خوراک کھا رہا تھا اور جے گھٹنوں کے بل جھکا بہت محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کھانا ختم کر کے کرکٹ نے جے کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں احسان مندی کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وہ پاک جذبۂ ایمان دیکھا جس نے ان مشکل دنوں میں اسے سہارا دیئے رکھا یہ یقین کہ اس کا مالک ضرور اس کی مدد کو آئے گا۔

میں نے اپنے بیٹے کو دیکھا جس نے اس یقین کے ساتھ اپنی کوشش جاری رکھی کہ اس کا مالک ایک نہ ایک دن ضرور اسے کرکٹ سے ملائے گا۔ آخر کار جیت یقین ہی کی ہوئی اور اللہ نے جے کی مدد کچھ اس انداز میں کی جس کو انسان کی عقل سوچ بھی نہیں سکتی۔

حسین رنگ کھولتے ہیں یہ حقیقت

بظاہر یہ ایک بے معنی سا ڈیزائن ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں.... اس ڈیزائن میں کیا چھپا ہوا ہے، یہ آپ کو اس وقت پتہ چلے گا جب آپ ہمارے بتائے ہوئے نمبروں میں وہی رنگ بھریں گے جو ہم آپ سے کہہ رہے ہیں۔ اپنی رنگین پنسلوں کا بکس لیجئے اور رنگ بھرنا شروع کر دیجئے۔

(۱) والے خانوں میں نیلا (۲) میں سُرخ (۳) میں گلابی (۴) میں سبز (۵) میں جامنی (۶) میں سیاہ (۷) میں پیلا۔

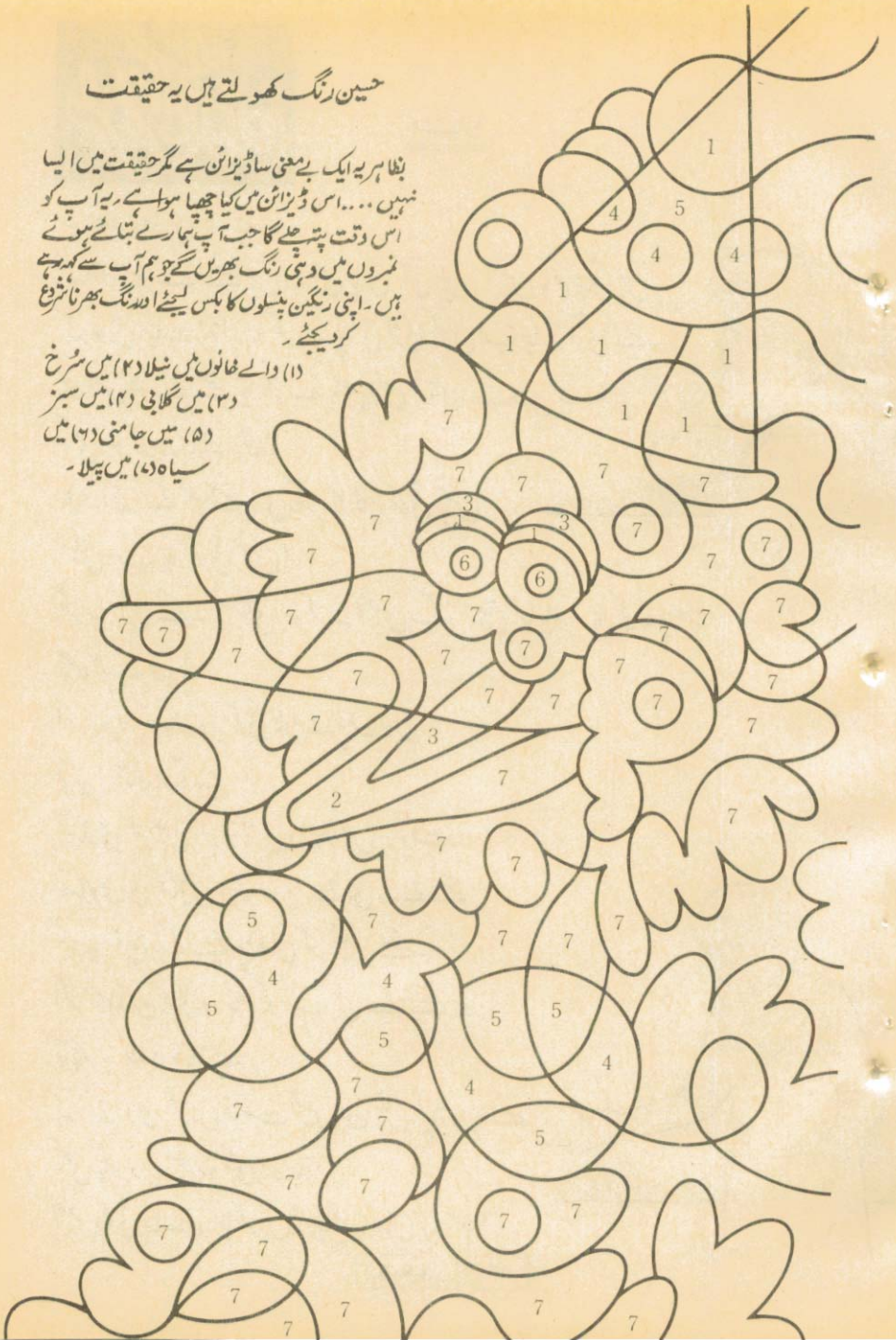

ہر روز کی الجھن

عمارہ

یہ قصّہ روز ہی کا ہے
کہ ہم بستر سے اٹھتے ہیں، تو امی پاس آتی ہیں، ہمیں ٹائم بتاتی ہیں
کہ نو جی سات بج اٹھے مگر، یہ پوستی لڑکی کہیں اب جا کر اُٹھی ہے۔
جو ہم چھوٹے تھے کیا ہم نے کبھی ایسی حسیں صبحیں نہ دیکھی تھیں؟
کبھی سو کر نہ اٹھے تھے؟
ہمیشہ اٹھ کے ہم بہنیں ہی گھر کا کام کرتی تھیں
سبق سب یاد کرتی تھیں!
مگر یہ آج کے بچے کبھی سو کر نہ اٹھیں گے، سبق کیا یاد کرنا، کیسا پڑھنا
چھوڑیئے توبہ!
اگر دوپہر کو کچھ دیر کوئی ناولٹ پڑھ لوں
تو یہ ارشاد ہوتا ہے
تمہاری عمر میں ہم تو کڑی دوپہر میں ہر وقت
نصابوں کی کتابیں بیٹھ کر پڑھتے ہی رہتے تھے
مگر یہ آج کے بچے پڑھائی کر نہیں سکتے۔
اگر ہم بہن بھائی، شام کو سب مل کے بیٹھے ہوں
تو پھر یہ طعنہ ملتا ہے۔
کہ سارا دن تمہیں فرصت نہیں ان غل غپاڑوں سے
کبھی کچھ دیر سنجیدہ بھی ہو جاؤ
ہمیں کوئی بتائے، کیا کریں؟ جائیں کہاں پہ ہم؟

پھر یادِ وطن کی آتی ہے

اے منان خرم بٹ، الریاض سعودی عرب

جس دن ہمیں پتہ چلا کہ ابّو نے جرمنی اور امریکہ جانے کا پروگرام بنایا ہے، وہ دن ہمارے لئے عید سے کم نہیں تھا۔ بہت پہلے سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ذہن نئے اور انوکھے پروگرام ترتیب دینے لگا جرمنی اور امریکہ نے بھی محبت کا اظہار کیا اور شکلیں بدل بدل کر خوابوں میں آنے لگے اور ہم ٹی وی پر دیکھے ہوئے پروگراموں میں سے ہیرو کو نکال کر اور خود اس کی جگہ فٹ ہو کر کبھی مجسمۂ آزادی کبھی ڈزنی لینڈ اور کبھی میامی کے ساحلوں پر گھومنے لگے۔ خوابوں اور انتظار کا یہ سلسلہ پچیس اکتوبر ۱۹۹۰ء کو ختم ہوا اور ہمارے اصل اور حقیقی سفر کا آغاز ہوا۔

ہم لوگ صبح ساڑھے نو بجے کی فلائٹ سے روانہ ہوئے تھے۔ یہ جرمنی کی قومی ایئرلائن "لوفتہا نزا" کا جہاز تھا۔ باجی کی اور میری سیٹیں کھڑکی کی طرف تھیں جن کے ذریعے ہم دنیا کو خاصی بلندی سے دیکھ سکتے تھے۔ الریاض کا فضائی نظارہ بہت شاندار تھا۔ فضائی میزبان نے کاروباری مسکراہٹ اور خوبصورت تحفے سے سفر کا آغاز کیا۔ ساڑھے چھ گھنٹے کا سفر تھا اس میں سوائے سونے کے ہم کوئی کام کی

بات نہ کر سکے۔ مغربی جرمنی میں ہمارا قیام ایئرپورٹ پر واقع ہوٹل شیرٹن میں تھا۔ ہمیں یہاں ڈیڑھ دن رکنا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت، کیوں نہ تھوڑی سی سیر کر لی جائے۔

جرمنی کا وقت سعودی عرب سے دو گھنٹے پیچھے ہے یعنی جب سعودیہ میں دن کے بارہ بجتے ہیں تو جرمنی میں اس وقت صبح کے دس بج رہے ہوتے ہیں۔ یہاں ٹرین کا زیرِ زمین نظام موجود ہے۔ ٹرین کا سفر ہمیشہ سے میری کمزوری رہا ہے۔ اس لئے ابو سے ضد کر کے میں نے مین فرینکفرٹ چلنے کے لئے کہا۔ اسٹیشن پر بالکل سناٹا تھا۔ میں نے ٹکٹ کے حصول کے لئے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ شاید سفید وردی میں ملبوس ریلوے کا کوئی اہل کار نظر آجائے مگر لگتا تھا کہ سب کے سب شام کی چائے پینے چلے گئے تھے۔

کسی انسان کی متلاشی میری نظریں ایک مشین پر جا کر اٹک گئیں۔ اس پر پورے شہر کا نقشہ بنا ہوا تھا اور یہ ہدایات بھی درج تھیں کہ جس جگہ جانا ہو وہاں کا نمبر دبا کر کرایہ کی قیمت معلوم کی جا سکتی ہے۔ مین فرینکفرٹ کا کرایہ پونے چار مارک تھا۔ برابر ہی ایک اور مشین تھی جو رقم بھنوانے کا کام انجام دیتی تھی۔ میں نے دس دس مارک کے دو سکوں کی "چینج" حاصل کی۔ اس وقت مجھے جرمنی کے ریلوے کے کارکنان پر بڑا ترس آرہا تھا۔ ان ایماندار مشینوں نے ان بے چاروں کا خاصا کام خراب کیا ہوگا۔ مجھے لاہور کا ریلوے اسٹیشن یاد آیا جہاں سیٹ بک کرانے سے مسافر کے گاڑی میں سوار ہونے تک مختلف مراحل میں مختلف لوگ پیسہ بناتے ہیں۔ بکنگ کلرک فرضی ناموں سے سیٹیں بک کر کے ٹکٹیں اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے جو جلدی کے مارے بہت سے مسافروں کو تیس روپے سے پچاس روپے زائد قیمت تک فروخت کی جاتی ہیں پھر قلی حضرات ہوتے ہیں جو مقررہ مزدوری سے دس گنا زیادہ کا مطالبہ کرتے ہیں اور پانچ گنا زیادہ پر راضی ہو کر مسافر پر احسان کرتے ہیں اور اس طرح حاصل شدہ رقم کے ذریعے بال بچوں کا پیٹ (آگ سے) بھرتے ہیں۔

جرمنی کے بے چارے ریلوے والوں کو یہ عیاشی میسّر نہیں ہے۔ نہ صرف کمرشل اسٹاف کو بلکہ ڈرائیور حضرات کو بھی۔ گاڑی کا وقت پانچ بج کر ستاون منٹ تھا۔ اور ہم نے دو منٹ پہلے ٹکٹ حاصل کر لئے تھے۔ خیال تھا کہ چند منٹ آرام کر لیں گے بھلا کبھی گاڑی بھی وقت پر آئی ہے لیکن افسوس کہ ہماری تمنا پوری نہ ہو سکی اور گاڑی عین وقت پر آگئی۔

مین فرینکفرٹ سے شاپنگ کے دوران میرے خزانۂ معلومات میں دو چیزوں کا اضافہ ہوا ایک تو یہ کہ سارے ہی بازار ایک جیسے ہوتے ہیں۔ چاہے وہ کراچی کا بازار ہو، چاہے ریاض کا یا فرینکفرٹ کا دوسری بات یہ پتا چلی کہ اگر بھاؤ تاؤ میں وقت اور دماغ ضائع نہ کیا جائے تو گاہک اور دکاندار دونوں ہی سکون محسوس

کرتے ہیں۔ کاش یہ بات ہمارے پاکستانی دکانداروں کی سمجھ میں بھی آجائے۔

میرے ابو "لوفتہانزا" میں ملازمت کرتے ہیں۔ اس لئے جرمنی سے امریکہ کے سفر کے دوران میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ جہاز کے کاک پٹ میں جاکر وہاں کے ماحول کا نظارہ کروں۔ میری فرمائش پر ابو جان نے ایئر ہوسٹس سے بات کی جس نے کپتان کی اجازت سے مجھے کاک پٹ پر پہنچا دیا لیکن اندر داخل ہونے سے پہلے اتنی سختی سے میری جامہ تلاشی ہوئی کہ تھوڑی دیر کے لئے میں خود کو کوئی ہائی جیکر سا لگا۔ کاک پٹ میں تقریباً پون گھنٹہ گزرا ۔ کپتان اور نائب کپتان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی مگر میری دلچسپی گفتگو سے زیادہ وہاں کے میکانی ماحول اور باہر کے نظاروں کی طرف رہی۔ سفید بادلوں کے ٹکڑے جہاز کے چاروں طرف تیرتے پھر رہے تھے جیسے پریاں ہوں جو کسی شہزادے کے استقبال کے لئے محوِ رقص ہوں۔

جب ہم امریکہ کے قریب پہنچے تو سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا جب کہ اس وقت پاکستان میں رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ میں بچپن میں سوچا کرتا تھا کہ سورج رات کو کہاں چلا جاتا ہے۔ اب پتا چلا کہ وہ امریکہ آجاتا ہے۔ ابو سے وقت کے اس اختلاف کے بارے میں پوچھا انہوں نے ہاتھ کی مٹھی سے گلوب کا کام لیتے ہوئے بتایا کہ امریکہ زمین پر اس جگہ واقع ہے (نیچے) جب کہ اس کے بالکل مخالف سمت میں (اوپر) پاکستان واقع ہے اس لئے جب امریکہ میں رات ہوتی ہے تو پاکستان میں دن ہوتا ہے اور جب امریکہ میں دن ہوتا ہے تو پاکستان میں رات ہوتی ہے ابو جان کی مٹھی والے گلوب پر امریکہ کی نشان دہی سے ایک اور بات فوراً میرے ذہن میں آئی۔ میں نے ابو سے کہا "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ امریکہ والے الٹے زمین سے چپکے ہوئے ہیں کیونکہ جب ہم، پاکستانی گلوب کے اوپر سیدھے چلتے ہیں تو ہمارے بالکل نیچے یہ امریکی الٹے ہی چلتے ہوں گے ناں!" میری بات سمجھ کر ابو جان نے قہقہہ لگایا۔ اور کہنے لگے۔ "امریکہ والوں کا بھی یہی خیال ہے کہ پاکستانی الٹے زمین سے چپکے ہوئے ہیں" میں نے فوراً کہا "ان کا خیال غلط ہے۔"

جب ہم بوسٹن ایئرپورٹ پر اترے تو درجۂ حرارت منفی تین درجے سنٹی گریڈ تھے۔ سخت سردی کا احساس ہوا مگر کزن کی ایئر کنڈیشنڈ کار نے اس احساس کو ذرا کم کیا۔

امریکہ میں ہمارا قیام "ویسٹ فیلڈ" میں تھا جہاں میرے کزن کا ذاتی جنرل اسٹور ہے۔ ان کے دو بچے ہیں۔ گول مٹول اور پیارے پیارے بڑا بیٹا حسان تین ساڑھے تین سال کا ہے انتہائی شریف اور سیدھا سادا۔ چھوٹا بیٹا ارسلان دو سال کا ہے اور ایک دم شرارتی بچہ ہے۔ پہلی ملاقات میں میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور انگریزی میں پوچھا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟" جواب ملا

"میں خیریت سے ہوں۔" اور جب میں نے خیریت معلوم کی تو کہنے لگا۔

"مجھے ارسلان کہتے ہیں۔"

بھابی نے بتایا کہ یہ اس کا خاص اسٹائل ہے اکثر باتوں کے الٹ جواب دیتا ہے بعض اوقات تو ایسی شرارتیں کرتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

امریکہ کے بارے میں جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ بڑے بڑے صاف ستھرے بازار، آراستہ دکانیں اور خوش اخلاق سیلز مین۔ میں نے ایک الیکٹرک ٹیلیفون خریدا جس میں ریکارڈنگ وغیرہ کا سسٹم بھی تھا۔ گھر آکر پتا چلا کہ اسے چلانے کے لئے دو سو بیس وولٹ بجلی کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ الریاض اور لاہور دونوں جگہ گھروں میں ایک سو دس وولٹ بجلی فراہم کی جاتی ہے۔ میں پریشان ہوا کہ اتنی مہنگی چیز یونہی بے کار پڑی رہے گی مگر جب کزن نے بتایا کہ خریدی ہوئی چیز ایک ہفتے تک واپس کی جاسکتی ہے تو مجھے بڑی حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ اگلے دن جب ہم نے وہ ٹیلی فون دکاندار کو واپس کیا تو اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے مسکراتے ہوئے وہ واپس لے لیا اور انتہائی خوش اخلاقی سے مزید پوچھا! "میں آپ کی اور کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اس کی خوش اخلاقی دیکھ کر میں دل ہی دل میں خاصا شرمندہ ہوا۔ اور اپنے اہل وطن دکانداروں کا رویہ یاد کر کے میں احساس کمتری کا شکار ہو گیا لیکن ایک واقعہ ایسا بھی پیش آیا جس نے امریکی اخلاقیات کا دوسرا رخ بھی میرے سامنے رکھ دیا۔

ہوا یوں کہ ایک دن ہم لوگ شاپنگ کر کے واپس آرہے تھے۔ وہیں نیچے ایک آٹومیٹک آئس کریم مشین سے میں نے اپنے اور حسان ارسلان کے لئے آئس کریم حاصل کی۔ ابھی میں نے آئس کریم کھانی شروع بھی نہیں کی تھی کہ ایک نیگرو آیا۔ مشین میں ایک ڈالر ڈالا۔ مگر ڈالر پھنس گیا۔ اس نے مشین کے دو ایک لاتیں جھاڑیں جب کچھ نہ بنا تو فوراً میری طرف پلٹا اور میری آئس کریم چھین کر رفوچکر ہو گیا۔ کزن نے بتایا کہ ایسے اور اس سے بھی سنگین واقعات یہاں کا معمول ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایک طرف تو یہ لوگ اتنے مہذب ہیں اور ایک طرف اتنے وحشی..... آخر کیوں؟

مجسمۂ آزادی اور ٹوئن ٹاور کی سیر بھی اس سفر کی حسین یادیں ہیں۔ مجسمۂ آزادی بالکل دریا کے بیچ میں بنا ہوا ہے۔ یہ دراصل ہاتھ میں مشعل پکڑے ہوئے ایک عورت کا مجسمہ ہے جو تمام دنیا کے انسانوں کی آزادی کی علامت ہے۔ اس کی پہلی دو منزلیں بذریعہ لفٹ طے کرنے کے بعد ۳۷۴ سیڑھیاں عبور کر کے ہم اس کے سر تک پہنچے۔ جوں جوں اوپر جائیں سیڑھیاں تنگ ہوتی جاتی ہیں۔ وہاں سے نیویارک کا نظارہ بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مجسمۂ آزادی کے نیچے ہی میوزیم بنا ہوا ہے جہاں شیشے کے چھوٹے چھوٹے کیبنوں میں وہاں کے مشہور سائنسدانوں کے مجسمے سجائے گئے ہیں۔

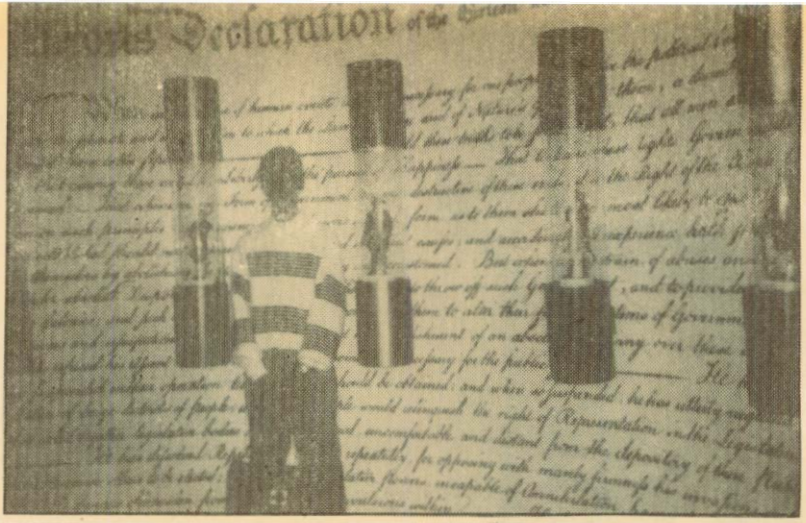

خرّم مجسمۂ آزادی کے میوزیم میں۔

ٹوئن ٹاور دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس کی ایک سو نو منزلیں ہیں حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کی تیز رفتار لفٹ صرف ایک منٹ بتیس سیکنڈ کے اندر آپ کو ایک سو ساتویں منزل پر پہنچا دیتی ہے یہ الگ بات کہ جب آپ لفٹ سے بر آمد ہوتے ہیں تو چند لمحے کے لئے آپ کی قوت سماعت مفلوج ہو چکی ہوتی ہے۔ میری ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا اور مجھے بار بار کانوں میں انگلیاں ڈال کر انہیں زبردستی کھولنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ ٹاور پر چڑھنے کا ٹکٹ آٹھ ڈالر فی کس ہے جب کہ اس کے اوپر لگی دوربین سے ماحول کا نظارہ کرنے کی فیس ایک ڈالر فی منٹ ہے۔

امریکہ کی سیر کا سب سے متاثر کن لمحہ وہ تھا جب میں ابو اور کزن کے ساتھ ایک کالج سے پراسپکٹس لینے گیا۔ کالج کے ملازمین سے پاکستان میں بھی واسطہ پڑتا رہا تھا اور ہر نئی جگہ داخلے کا مرحلہ بڑی تکلیف دہ یادوں سے وابستہ رہا ہے۔ مگر یہاں کا ماحول دیکھ کر مجھے لگا کہ امریکہ اگر دنیا بھر پر حکومت کرتا ہے تو ٹھیک ہی کرتا ہے کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی امامت اور قیادت ہمیشہ اس قوم کے ہاتھ میں رہی ہے جس نے خود کو علم کی دولت سے مالا مال کیا۔ امریکی عوام کی علم دوستی اور وہاں کے تعلیمی اداروں کے مرعوب کن ماحول کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔

کالج سے پراسپکٹس حاصل کرنے کے بعد ہم نے کلرک سے زبانی معلومات کرنی چاہیں تو اس نے خندہ پیشانی سے کافی دیر تک ہمارے ہر سوال کا جواب اتنی تفصیل سے دیا کہ ہمیں پراسپکٹس پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ تب میرے دل نے دعا مانگی کہ یاالٰہی ہمارے تعلیمی اداروں کو بھی ایسا ہی علمی ماحول عطا کر تاکہ نوجوان مسلم دوبارہ اس بیکراں آسمان پر جگمگا سکے کہ جہاں کا وہ ٹوٹا ہوا تارہ ہے۔

وہ مرد درویش

فاروق عادل

وہ کشمیر کے اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جسے "سپرو" کہا جاتا تھا۔ اسلامی دور میں کشمیر میں جنہوں نے سب سے پہلے پڑھنا لکھنا شروع کیا انہیں سپرو کا لقب دیا گیا۔اقبال کشمیر کے اسی سپرو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ کشمیری زبان میں سپرو اس لڑکے کو کہتے ہیں جو کم عمری میں ہی ذہانت کی باتیں کرے۔ اقبال اپنے خاندان کے اعتبار سے تو سپرو تھے ہی، خود بھی سپرو ہی تھے۔ وہ بچپن ہی میں ایسی ایسی ذہانت آمیز باتیں کر دیتے کہ لوگ حیران رہ جاتے۔

یہ واقعہ تو ہم نے سن ہی رکھا ہے کہ ایک مرتبہ اقبال کلاس روم میں ذرا دیر سے پہنچے تو ان کے استاد محترم نے کہا "اقبال تم دیر سے آئے ہو۔"

انہوں نے فوراً ہی جواب دیا "سر! اقبال ہمیشہ دیر ہی سے آتا ہے۔"

ایک مرتبہ اقبال اپنے محلے کی ایک دکان پر اس طرح کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ ان کا دایاں پاؤں زمین پر تھا اور بایاں پاؤں انہوں نے جوتا اتار کر چند فٹ اوپر دکان کے تختے پر رکھا ہوا تھا، اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ ان کے استاد محترم مولوی میر حسن بازار سے گزر رہے ہیں۔ اقبال دوسرا جوتا پہنے بغیر ہی ان کے پیچھے چل دیئے اور انہیں گھر پہنچا کر واپس آئے اور جوتا پہنا۔

اسی طرح جب ان کے افکار کی خوشبو پوری دنیا میں پھیلی اور عالمی دانشوروں نے ان کے کلام کے ترجموں کو دیکھ کر ان کی عظمت کا اعتراف کیا تو اس

وقت کی حکومت نے انہیں سر کا خطاب دینے کا فیصلہ کیا مگر انہوں نے اس خطاب کو اس وقت تک قبول کرنے سے انکار کر دیا جب تک حکومت نے ان کے محترم استاد مولوی میر حسن صاحب کے لئے شمس العلماء کے خطاب کا اعلان نہ کر دیا۔

آپ کے والد محترم نور محمد صاحب ایک درویش منش بزرگ تھے، وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا اسلام کا خادم بنے۔ چنانچہ اقبال کے استاد مولوی میر حسن صاحب کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ آپ بچے کو اسکول کی تعلیم دینے کی بجائے صرف دینیات کا درس دیا کیجئے اور آئندہ یہ اسکول جانے کی بجائے صرف مسجد جایا کرے گا۔ مولوی میر حسن صاحب نور محمد صاحب کی بات سن کر مسکرائے اور کہا کہ یہ بچہ صرف مسجد میں پڑھنے کے لئے نہیں مکتب میں پڑھنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور یہ اسلام کی اتنی خدمت کرے گا جس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اقبال کی آواز بہت اچھی تھی، وہ روزانہ علی الصباح قرآن حکیم کی تلاوت بہت خوش الحانی سے کیا کرتے تھے۔ ایک روز اقبال تلاوت کر چکے تو آپ کے والد صاحب نے آپ کو اپنے پاس بلایا اور کہا،

"جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اترا ہے۔"

اقبال کو یاد نہیں کہ والد صاحب نے ان سے جب یہ بات کہی تھی تو وہ اس کا مطلب سمجھے بھی تھے یا نہیں مگر یہ بات انہیں ہمیشہ یاد رہی اور اسی بات نے ان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ قرآن پاک کی روزانہ تلاوت ان کی زندگی بھر کا معمول رہا۔ تلاوت قرآن حکیم کے دوران ان پر وجد طاری ہو جاتا اور روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ جاتیں۔

علامہ اقبال فوت ہوئے تو ان کی وصیت کے مطابق ان کی ہزار ہا قیمتی کتابیں اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری کو عطیہ کے طور پر دی گئیں مگر وصیت کے مطابق قرآن حکیم کا ایک خاص نسخہ ان کے بیٹے جاوید اقبال صاحب کو دیا گیا جو کچھ عرصہ پہلے سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

علامہ کی زندگی عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عبارت تھی۔ جس وقت بھی حضورؐ کا ذکر ہوتا، ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ ایک مرتبہ آپ کسی دولت مند شخص کے ہاں مہمان تھے، رات کو جب آپ آرام کرنے کے لئے اپنے کمرے میں تشریف لے گئے تو ہر طرف قیمتی ساز و سامان دیکھ کر ایک دم آپ کو خیال آیا کہ رسولؐ پاک جن کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں وہ تو ساری زندگی بوریئے پر سوتے رہے اور ہم اس طرح عیاشی کرتے ہیں۔ بس اس خیال کے ساتھ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، آرام دہ بستر پر لیٹنا ان کے لئے دوبھر ہو گیا۔ بیڈ

روم سے ملحق غسل خانے میں جاکر کرسی پر بیٹھ گئے اور رونا شروع کر دیا، کافی دیر کے بعد جب دل کو قرار آیا تو ملازم کو بلوا کر چارپائی غسل خانے میں بچھوائی اور گھر سے ساتھ لایا ہوا بستر اس پر لگوا کر رات گزاری اور جتنے دن وہاں مہمان رہے اسی جگہ سوتے رہے۔

اس زمانے کے جدید پڑھے لکھے مسلمان حضور اکرمؐ اور انبیاء کرام کے معجزات کو نہیں مانتے تھے یا کہا کرتے تھے کہ یہ محض اشارے اور بات سمجھانے کے طریقے ہیں مگر آپ مولانا مودودیؒ کے بقول ان معجزات کے "ٹھیٹھ (خالص) لفظی" مفہوم پر ایمان رکھتے تھے۔

اقبال کے ایک قریبی دوست سید نذیر نیازی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ باتوں باتوں میں آپؐ کے معروف صحابی حضرت ابو سعید خدری کی اس روایت کا ذکر آیا کہ ایک مرتبہ جب حضورؐ احد کے پہاڑ پر تشریف لے گئے تو احد کانپ اٹھا، اس پر وہاں موجود کچھ لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا تو علامہ جو اس وقت کسی تکلیف کی وجہ سے لیٹ کر بات کر رہے تھے، تکلیف کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئے اور کہا کہ "یہ محض استعارہ نہیں!" انہوں نے پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ "یہ محض استعارہ نہیں" پھر فرمایا "اگر تم حقائق سے آگاہ ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ایک نبی کے نیچے مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز جاتے ہیں، مجازی طور پر نہیں، واقعی لرز اٹھتے ہیں۔"

علامہ کے ایک دوست حکیم احمد شجاع سے روایت ہے کہ ایک روز وہ ان کے گھر حاضر ہوئے تو بہت فکر مند، مغموم اور بے چین تھے۔ حکیم صاحب نے گھبرا کر خیریت پوچھی تو غم انگیز لہجے میں فرمایا:

"یہ سوچ کر میں اکثر مضطرب اور پریشان ہو جاتا ہوں کہ کہیں میری عمر رسولؐ کی عمر سے زیادہ نہ ہو جائے۔"

(اللہ نے بھی ان کی اس محبت اور عقیدت کی لاج رکھ لی اور آپ نے ۶۱ برس کی عمر میں وفات پائی)

ان کے بعض خطوط اور قریبی دوستوں کے ذریعے پتہ چلتا ہے کہ آپ نہ صرف عبادات کے پابند تھے بلکہ راتوں رات اٹھ اٹھ کر بھی عبادت کرتے تھے، نماز تہجد بھی ادا کیا کرتے تھے۔

آپ بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے لکھا ہے کہ وہ بہت کم سوتے اور بہت کم کھاتے تھے، صبح بہت جلد اٹھ جاتے کھانے پینے کے طریقے بھی بہت سادہ تھے، کھانا کھانے بیٹھتے تو جو بھی پاس بیٹھا ہوتا اسے شریک کر لیتے۔

کرتا شلوار اور سر پر سفید کپڑے کی پگڑی ان کا پسندیدہ لباس تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ملک سے باہر گئے تو انگریزی لباس بھی پہنا، لیکن وطن واپسی کے بعد بیشتر شلوار قمیص زیب تن کرتے

اگر کبھی پینٹ پہن لیتے تو سر پر ترکی ٹوپی ضرور اوڑھ لیتے اپنی وفات سے کچھ دنوں قبل اپنے بیٹے سے باتیں کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ مجھے شلوار پتلون سے زیادہ پسند ہے۔

آپ بہت خود دار تھے۔ ان کی آخری عمر تھی، پورے ہندوستان میں آپ کی عظمت کو تسلیم کیا جا چکا تھا، آپ کے یوم پیدائش پر حیدر آباد دکن میں ایک تقریب منائی گئی اور آپ کی خدمات کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے حیدر آباد کے حکمران "نظام" نے بطورِ خاص ایک کثیر رقم کا چیک ارسال کیا۔آپ نے وہ چیک یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ "شاید آپ لوگوں نے مجھے سمجھا نہیں۔"

آپ کی شاعری کی ابتدا بچپن ہی سے ہوگئی تھی علامہ کے زمانۂ طالب علمی میں سیالکوٹ میں ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا، علامہ کبھی کبھار اس میں غزلیں پڑھا کرتے تھے۔بعد میں لاہور آئے تو بعض دوستوں کے اصرار پر انہوں نے لاہور کے ایک مشاعرے میں اپنا کلام سنایا۔ اس مشاعرے کی صدارت مرزا ارشد گورگانی نامی ایک شاعر کر رہے تھے، علامہ جب یہ شعر سنایا کہ ع

موتی سمجھ کر شانِ کریمی کے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو ارشد گورگانی پھڑک اُٹھے اور ان کی شاندار شاعری کی پیشن گوئی کی۔ علامہ نے سب سے پہلے ان ہی سے اپنے کلام میں اصلاح لی۔ بعد میں حضرت داغ دہلوی سے رہنمائی حاصل کی۔ اسی زمانے میں لاہور کے ایک معروف شاعر نے کہا کہ "اقبال، غالب کے بعد اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے۔"

بعد میں تو اقبال شاعری کے آسمان پر ایسے چمکے کہ کوئی ان کا ثانی نہ رہا۔ یورپ سے واپس آنے کے بعد آپ نے فارسی زبان میں شاعری کرنے پر زیادہ توجہ دی اسی زمانے میں آپ کی فلسفیانہ مثنوی اسرارِ خودی شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت کے تین سال کے بعد یعنی ۱۹۱۸ء میں ایک انگریز عالم پروفیسر نکلسن نے، جو فارسی کے بہت بڑے ماہر تھے، اقبال سے درخواست کی کہ وہ انہیں اس مثنوی کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اجازت دیں۔ آپ کی اجازت سے جب اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا تو یورپ اور امریکہ کی عالمی دنیا میں تہلکہ مچ گیا اور اس پر بے شمار مضامین شائع ہوئے اور آپ کے فلسفہ خودی کی شہرت ہندوستان سے نکل کر پوری دنیا میں پھیل گئی۔

آپ مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لئے تو بے چین تھے مگر عملی سیاست میں شریک ہونے میں انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی مگر ۱۹۲۶ء میں ان کے بعض دوستوں نے ضد کر کے انہیں کونسل کی رکنیت کے لئے انتخابات میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا۔ آپ کی پوری انتخابی مہم عوام نے خود چلائی۔ آپ اس مہم کے صرف ایک جلسہ میں شریک ہوئے اور تقریر کی۔

انہوں نے اس تقریر میں اپنے لئے ووٹ بھی نہیں مانگے بلکہ کونسل کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ مگر عوام میں آپ کی مقبولیت اتنی زبردست تھی کہ آپ کے دو مخالف امیدوار تو انتخاب سے پہلے ہی مقابلے سے دستبردار ہوگئے جب کہ انہوں نے حریف امیدوار پر تین ہزار ووٹوں کی برتری حاصل کی۔ کونسل کا رکن بننے پر آپ نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے بہت سے اہم قوانین منظور کرائے۔

جب آپ نے سیاسی میدان میں قدم رکھا تو چار ہی سال کے عرصہ میں آپ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی نمائندہ آواز بن گئے اور دسمبر ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت بھی انہوں نے کی۔ جس میں انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک الگ وطن کے قیام کے لئے تجاویز پیش کیں۔ اس وقت مخالفین نے کہا کہ یہ باتیں ایک شاعر کا خیال ہیں جن کی کوئی حیثیت نہیں۔ مگر دس ہی سال کے بعد علامہ کے یہ خیالات حقیقت بن کر سامنے آگئے جب ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قرار داد پاکستان منظور ہوئی اور قائد اعظم رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آج اگر اقبال زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے کہ ان کے خیالات آج عملی صورت اختیار کر رہے ہیں۔

یہ درست ہے کہ اقبال جسمانی طور پر ہمارے درمیان موجود نہیں، مگر وہ اب بھی زندہ ہیں، اپنے ان زندہ افکار کی وجہ سے جو ان کے کلام کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں اور وہ زندہ ہیں اپنے پاکستان کی صورت میں جو ان کے خوابوں کی تعبیر ہے۔

متوازن غذا
صحت کی ضامن

ماہرین غذائیت، غذاؤں کو درج ذیل چار حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں

- سبزیاں، پھل اور فروٹ
- اناج، چاول، گندم اور دالیں وغیرہ
- دُودھ، مکھن، گھی، پنیر اور دہی وغیرہ
- گوشت، انڈے، مُرغی اور مچھلی وغیرہ

اگر آپ نے دن بھر کی غذاؤں میں ان چاروں حصّوں سے کچھ نہ کچھ کھا لیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے متوازن غذا کھالی اور آپ کے جسم کو مطلوبہ توانائی میسر آگئی۔

اشتہار برائے ترغیب حفظان صحت و تندرستی اطفال - آنکھ مچولی

بیدار قوم ہونہار بچے

سلیم مغل

زیرِ نظر مضمون کا پہلا حصہ گزشتہ شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ پہلے حصے میں جن موضوعات کو سمیٹا گیا تھا وہ یہ ہیں۔ جاپان کا تعارف، محل وقوع، لوگ، عادات و مزاج، جاپانی طریقۂ تعلیم، بچوں سے اساتذہ کے روابط کی نوعیت، اسکولوں میں نصابی اور غیر نصابی تدریس، جاپانی بچوں کا سلیقہ و قرینہ..... زیرِ نظر مضمون دوسری اور آخری قسط ہے۔

○ ..... آپ مانیں یا نہ مانیں مگر یہ سچ ہے کہ جاپانی دنیا کی واحد قوم ہے جس کے بچوں کے پاس بھی بڑوں کی طرح وقت بالکل نہیں ہوتا۔ سونے سے بیدار ہونے تک اور آنکھ کھلنے سے آنکھ لگنے تک بچوں کا ایک ایک لمحہ طے شدہ وقت کے مطابق گزرتا ہے۔ جاپانی بچوں نے اپنی زندگی کو جس طرح وقت کے شکنجے میں دے رکھا ہے اس پر ہم جیسے سیلانی لوگوں کا تعجب بے معنی نہیں۔

بچوں کی تیز اور مشینی زندگی دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ ہم اگر رک گئے تو کہیں پیچھے ہی نہ رہ جائیں۔

○ ..... جاپانی بچے اپنی ماں کی قربت میں رہتے ہیں۔ ان کی تعلیم، ان کی دیکھ بھال، تربیت یہ سب کچھ ماں کے فرائض میں شامل ہے۔ بچے بھی ماں سے

یوں چمٹے رہتے ہیں جیسے کنگرو کے بچے کنگرو ماں سے۔ یہاں تک کہ ماں اور باپ دونوں اگر کہیں تفریح کے لئے نکلتے ہیں تو چھوٹا بچہ ماں اٹھائے ہوئے ہوگی جاپان میں باپ کے سینے سے چمٹے ہوئے بچے شاید ہی نظر آئیں ..... جاپان میں خواتین اور مرد سبھی ملازمت کرتے ہیں لیکن بچے کی پیدائش کے بعد مائیں اکثر ملازمت چھوڑ کر سارا وقت اپنے بچے کو دیتی ہیں۔ اس وقت تک جب تک کہ بچہ خود چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو جائے۔ بچہ بڑا ہو جائے تو مائیں پھر سے ملازمت کر لیتی ہیں

○ ..... جاپان میں ہر فیملی کے ایک سے دو تک بچے ہوتے ہیں۔ فی فیملی بچوں کی شرح ۱٫۶ ہے۔ اگر کوئی کہہ دے کہ میرے چار بچے ہیں تو سننے والے کا منہ حیرت سے کھل جاتا ہے۔

○ ..... جاپانی بچہ ایک سال کا ہوتے ہی ماں کی گود سے اتر جاتا ہے۔ ماں باپ اسے زیادہ سے زیادہ پیدل چلنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ پیدل چلتے ہوئے بچہ اپنا سامان بھی اپنی پشت سے خود ہی باندھ کر چلتا ہے۔ ماں باپ اس وزن میں حصہ بانٹنے کو بچے کی عادتیں خراب کرنے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ ٹرین میں سفر کرتے ہوئے بس میں جاتے ہوئے بچہ اپنا سفری پاس اپنا سامان سب کچھ خود ہی لے کر چلتا ہے۔

○ ..... بچہ اجنبی لوگوں سے بے تکلف نہیں ہوتا۔ مہمان کو دیکھ کر خوش ضرور ہوتا ہے مگر دور دور سے۔ ماں کے کہنے پر بھی قریب جانا یا کوئی چیز لینا اچھا خیال نہیں کرتا۔ بچے شرارتیں بھی کرتے ہیں مگر مانوس ماحول میں۔

○ ..... کتنی عجیب بات ہے کہ جاپان میں بچوں کے گال پر بوسہ نہیں دیا جاتا۔ بڑے بچوں سے اپنی محبت کا اظہار چہرے کے تاثر سے، مسکرا کر اور جھک کر کرتے ہیں۔ بچے بھی یہی کچھ کرتے ہیں۔

○ ..... جاپان میں غلیظ زبان بولنے یا گالی دینے کا تصور تو سرے سے ہے ہی نہیں۔ بچوں کے درمیان کبھی کبھار لڑائی ضرور ہو جاتی ہے۔ مگر اس لڑائی میں بھی قدم لڑکھڑا سکتے ہیں، زبان نہیں۔ شائستگی جاپانیوں کی شناخت بن گئی ہے۔ غصہ آجائے تو زیادہ سے زیادہ "بُچا" Bucha کہہ دیں گے جس کے معنی ہیں۔ "بیوقوف"

○ ..... جاپانی بچے فطرتاً کم گو اور شرمیلے ہوتے ہیں۔ ملتے جلتے ہوئے جلدی بے تکلف نہیں ہوتے، جھجکتے ہیں۔ اپنے دائرے یا اپنے گروپ میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ نئے حلقے میں جلدی Adjust نہیں ہو پاتے۔ یہاں تک کہ نانی دادی بھی اگر قریب نہیں رہتیں تو ان کی آمد پر ان سے بھی کھنچے کھنچے رہتے ہیں اور جلدی قریب نہیں آتے۔ جاپانیوں کے ہاں نانی دادی سے قربت کا تصور ہم اہل برصغیر سے مختلف ہے۔

○ ..... جاپانی بچے وقت کے انتہائی پابند ہوتے ہیں۔ قانون کا احترام تو گویا ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ "یہ دیکھئے یہ سڑک کے کنارے ایک پول

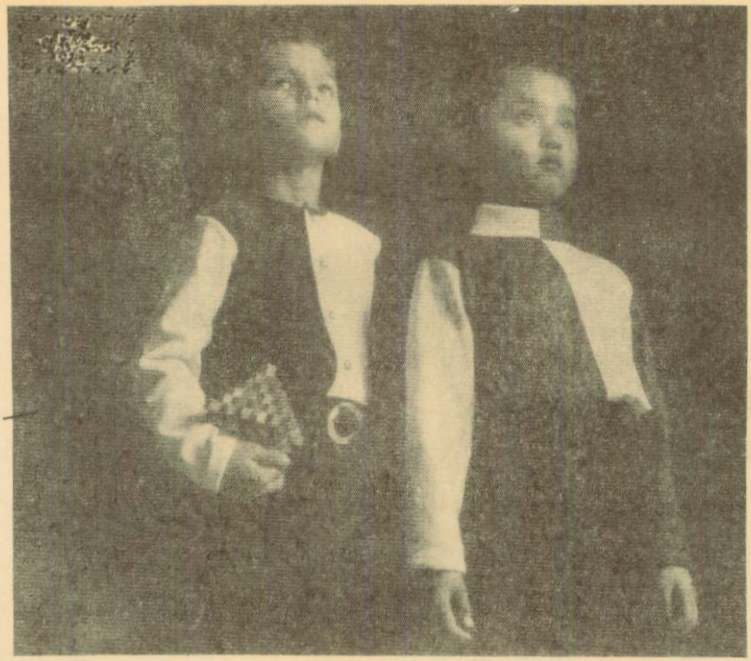

آنکھوں میں مستقبل کے سُنہرے خواب سجائے دُور اُفق کے اُس پار دیکھتی آنکھیں!

کے ساتھ جو ڈبہ بندھا ہوا ہے۔ اُس میں بہت سے سرخ رنگ کی جھنڈیاں لکڑی سے بندھی ہوئی رکھی ہیں۔ ایک بچہ آیا اس نے سرخ جھنڈی نکالی اور ہاتھ بلند کر کے ہوا میں لہرا دی۔ سرخ جھنڈی دیکھ کر دور سے آنے والے ٹریفک نے بریک لگانے شروع کر دیئے۔ ٹریفک رک گیا اور بچے نے آرام سے سڑک عبور کر کے، جھنڈی کو سڑک کے دوسرے جانب رکھے ہوئے ڈبے میں ڈال دیا۔" بچے نے یہ جھنڈی صرف ضرورت کے وقت استعمال کی تھی۔ محض کھیل یا شرارت کے لئے نہیں۔

○ ..... بچوں کو کوڑا کرکٹ کہیں گرا ہوا نظر آجائے تو اسے فوراً اٹھا کر قریب ہی رکھے ہوئے کسی ڈسٹ بن میں ڈال دیں گے۔ ایک پاکستانی سیاح اور قلم کار الطاف شیخ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ "میں ایک پارک میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے سگریٹ پی کر ڈبیہ ایک طرف پھینک دی۔ اس اثناء میں ایک چھوٹا سا بچہ اپنی ماں کا ہاتھ چھڑا کر بھاگا بھاگا آیا اور ڈبیہ اٹھا کر ایک ڈسٹ بن میں پھینک دی۔ میں شرمندہ شرمندہ اس بچے کو دیکھتا ہی رہ گیا۔"

○ ..... جاپانی بچوں کو "جیب خرچ" دیا جاتا

ہے۔ بچوں کے ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ بچہ جیب خرچ کو خود اپنی مرضی سے خرچ کرے تاکہ اس میں فیصلہ کرنے اور اپنی پسند و ناپسند سے چیزیں خریدنے کی صلاحیت پیدا ہو۔

○ ..... جاپان میں طبقات نظر نہیں آتے۔ ایسا لگتا ہے کہ سب بچے ایک سے حالات میں رہتے ہیں۔ اگر بچوں کے درمیان مالی اعتبار سے کچھ فرق ہے بھی تو وہ ان کے لباس، طور طریقوں یا دوسرے کسی عمل سے ظاہر نہیں ہوتا۔

جاپانیوں کا مخصوص لباس "کیمونو" کہلاتا ہے جسے مرد اور عورت بھی پہنتے ہیں۔ مگر دونوں کے اسٹائل میں واضح فرق ہے۔ بچے بھی "کیمونو" زیب تن کرتے ہیں مگر اب یہ لباس اہم تقاریب اور تہواروں تک کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔

○ ..... ماں باپ بچوں کے لئے قیمتی سے قیمتی کپڑا بھی خریدیں گے تو سادگی کا خیال رکھیں گے۔ شوخ کپڑے بھڑکیلے رنگ اور فرل والے کپڑے جاپانیوں کو زیادہ پسند نہیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے جاپانی بچے اتنے اچھے ہیں تو پھر ان کی پٹائی تو بالکل نہیں ہوتی ہوگی۔ یہ بات کسی حد تک ٹھیک ہے کہ عام طور پر بچوں کی پٹائی نہیں ہوتی مگر بالکل ایسا بھی نہیں۔ اگر کوئی بچہ زیادہ شرارت کرے اور امی کو غصہ آجائے تو پھر ہاتھ کی پشت پر دو انگلیوں سے بچوں کی پٹائی ہوتی ہے۔ اس ہلکی پھلکی پٹائی کو بھی وہاں کافی سمجھا جاتا ہے۔

○ ..... جاپانی بچے اپنے بڑوں کی طرح بہت محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ وہ اپنی محبت کا اظہار الفاظ سے شاید بہت زیادہ نہ کر پاتے ہوں۔ جاپانیوں کو اپنے جذبات پر قابو رکھنے کا فن آتا ہے۔ بچے بھی اپنے محسوسات کو جلدی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ البتہ وہ دوستیاں کرتے ہیں، تحائف دیتے ہیں، ملاقاتیں کرتے ہیں مگر اپنے گھروں پر نہیں۔ بازار، ہوٹل، ریسٹورینٹ یا پارک وغیرہ میں مہمانوں کو ملاقات کا وقت دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے اپنے گھر کو وہ مہمانوں کے لئے اپنے دل سے زیادہ کشادہ نہ پاتے ہوں۔ ویسے جاپان میں یہ مسئلہ ہے بھی کہ مکان چھوٹے ہیں اور زمین کے دام بہت زیادہ۔

جاپانی یوں بھی مکان کو ایک نجی اور ذاتی جگہ کہتے ہیں۔ جہاں عام آدمیوں کا آزادانہ آنا جانا انہیں کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا۔

البتہ جن لوگوں کے گھر کشادہ ہیں۔ وہ مہمانوں کو گھروں پر بھی مدعو کرتے ہیں۔

○ ..... جاپانی بچے اپنے بڑوں کی طرح کھانے پینے کے خوب شوقین ہوتے ہیں۔ والدین بھی بچوں کی غذاؤں پر توجہ دیتے ہیں۔ جاپانی بچے، تازہ جوس، دودھ، پھل، مچھلیاں اور سبزیاں شوق سے کھاتے ہیں۔ تازہ جوس پینے کا شوق بھی ہے اور رواج بھی۔ کہتے ہیں کہ جاپانی پانی کم پیتے ہیں اور جوس زیادہ۔ اسی طرح بچوں کو دودھ پلانے پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ ایک سال کی عمر

میں بچوں کا فیڈر لازماً چھڑا دیا جاتا ہے۔

مچھلی تو جاپانیوں کی پسندیدہ اور مرغوب غذا ہے۔ بعض ماہرین غذائیت کا خیال ہے کہ جاپانیوں میں بیماریاں کم ہونے کی ایک وجہ مچھلی کا بکثرت استعمال بھی ہے۔

جاپانی بچے کھانا کھاتے ہوئے اپنے بڑوں کی طرح چاپ اسٹک کا استعمال بڑی مہارت سے کرتے ہیں۔ چاپ اسٹک پلاسٹک یا لکڑی کی دو پتلی پتلی ڈنڈیاں ہوتی ہیں جنہیں ایک ہی ہاتھ کی انگلیوں سے بیک وقت اس طرح پکڑا جاتا ہے کہ دونوں ڈنڈیوں کی مدد سے مطلوبہ کھانا اٹھا کر منہ تک لایا جاسکے، جاپان میں ان ڈنڈیوں کو "اوہاشی" کہتے ہیں۔ اوہاشی سے چاول کا ایک ایک دانہ اٹھا کر منہ میں رکھ لینا، آسان بات نہیں، اس عمل کیلئے مسلسل مشق کی ضرورت ہے۔

○ ..... جاپانی ریسٹورینٹ میں بچوں کے لئے علیحدہ مینیو دیا جاتا ہے۔ بچے اپنی پسند سے اپنے کھانے کا آرڈر دیتے ہیں۔ ہوٹل مینجمنٹ کا کہنا ہے کہ بچوں کے علیحدہ مینیو، بچوں کو اپنے طور سے فیصلہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہی قوت فیصلہ آگے چل کر عملی زندگی میں ان کے کام آئے گی۔

○ ..... جاپانی ذرائع ابلاغ بچوں کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ اخبارات، رسائل، ٹی وی، ریڈیو کوئی ایسا ذریعۂ ابلاغ نہ ہوگا جو بچوں کی تعلیم، تربیت، راہنمائی اور ان کی تفریح طبع کے لئے منصوبہ بندی نہ کرتا ہو۔

○ ..... جاپانی حکومت اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لئے سو سو جتن کرتی ہے اور انہیں بے التفاتی کا شکار نہیں ہونے دیتی۔

○ ..... راہ چلتے لوگ بچوں سے خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں مسکرا کر اور جھک کر ملتے ہیں اور ان کا ہر طور سے خیال رکھتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے جیسے پوری جاپانی قوم اپنے بچوں کے روشن مستقبل کے لئے ہمہ تن مصروف ہے۔ اس نکتے کو شاید جاپانی بہتر طور سے سمجھ پائے ہیں کہ "بچہ ہی آنے والی کل ہے۔" بیدار قومیں یہی کچھ کرتی ہیں جو جاپانی کر رہے ہیں۔ ہونہار نسلیں وہیں پیدا ہوتیں ہیں جہاں اتنے دور اندیش لوگ رہتے ہوں۔

گزشتہ ماہ شائع ہونے والے اس مضمون کے پہلے حصے میں لفظ 'HADAKI MUSS' بہ معنی "یہ نعمتیں عطا کردہ ہیں" سہواً غلط شائع ہوگیا ہے۔ اس مفہوم کے لئے مستعمل جاپانی لفظ 'ITADAKI MUSS' توجہ دلوانے پر ہم قارئین کے ممنون اور سہو پر معذرت خواہ ہیں۔

"ماما کہاں جارہی ہیں؟" رانا نے کمرے سے باہر آتے ہوئے پوچھا۔
"بیٹے ذرا شاپنگ کے لئے جارہی ہوں۔ ابھی آجاتی ہوں۔"
"میں بھی ساتھ چلوں .....؟" رانا خوشامدی لہجے میں بولا۔
"بیٹے..... پھر گھر میں کون رہے گا....." ماما بولیں۔
"اچھا....." رانا نے سر جھکاتے ہوئے کہا اور پاؤں پٹختا ہوا واپس کمرے کے اندر چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ماما ایک مرتبہ جو بات کہہ دیں، پھر اس سے نہیں ٹلتیں۔ کمرے میں آکر اس نے کتاب کھول لی۔ کتاب میں لطیفے تو بڑے مزے کے تھے لیکن رانا کو ذرہ بھر بھی لطف نہ آیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔
"فرہاد کی امی کتنی اچھی ہیں۔ کل وہ بتا رہا تھا کہ جب وہ اپنی امی کے ساتھ بازار گیا تو اس نے کتنے

غلطی میری تھی

عمران فیصل صدیقی

پیارے پیارے کھلونے خریدے اور متین..... اس کے تو ٹھاٹ ہیں، نرالے ہیں۔ جو بات کرتا ہے فٹ پوری! کیسی خوبصورت سائیکل خرید کے دی ہے اس کے ابو نے اسے! لیکن میں کیا ہوں، میری کون سنتا ہے۔ اکیلے گھر میں دیواروں سے ہی باتیں کرتا رہتا ہوں....." وہ یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ اسے نیند نے آلیا۔ جب بیدار ہوا تو اس کی ماما واپس آچکی تھیں مگر اس کے لئے کچھ لانا "بھول" گئی تھیں۔ رانا نے بھی تکرار مناسب نہ سمجھی۔
اگلے روز اسکول میں پھر اسے اپنے دوستوں کی دل جلانے والی باتیں سننا پڑیں۔ راحیل بتا رہا تھا کہ

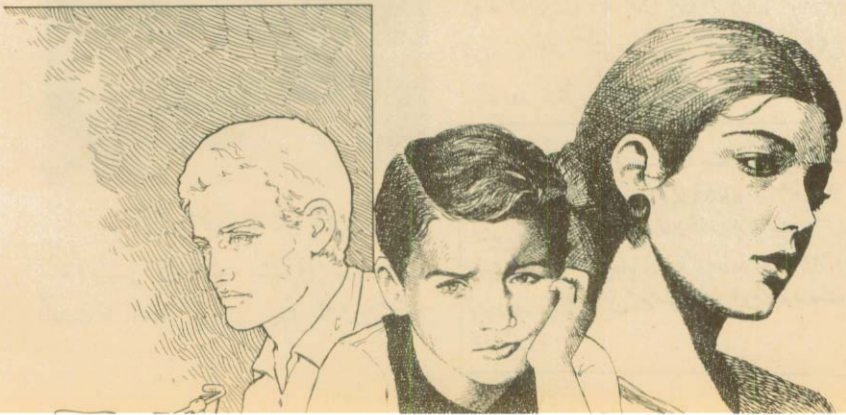

وہ اپنے ابو کے ساتھ یورپ کی سیر کو جائے گا۔ حفیظ کی کلائی پر جگمگاتی گھڑی کی سب ہی تعریف کر رہے تھے۔ رانا یہ سب دیکھ کر اداس ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کیا۔ جونہی اس کے ابو کا کراچی سے فون آئے گا وہ انہیں ایک سائیکل اور ایک گھڑی لانے کی فرمائش کرے گا۔ اس کے علاوہ اگلی دفعہ ابو کو اکیلا بھی جانے نہیں دے گا۔

ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ گزرا تھا کہ ایک شام اس کے ابو کا فون آیا۔ رانا نے بھی بات کی۔ اس نے بڑے جوش سے کہا۔ "ابو..... میرے لئے سرخ رنگ کی سائیکل..... اور..... اور سنہری چین والی گھڑی ضرور لائیے گا....." "دیکھوں گا بیٹے....." اس کے ابو نے جواب دیا۔ رانا کی خوشی اور جوش پر ایکدم پانی پھر گیا۔

اس نے روہانسا ہو کر فون ماما کے حوالے کیا اور بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔

جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے۔ رانا کے ذہن میں تلخیوں کا ایک جال سا بچھتا چلا جا رہا تھا۔ آئے روز کوئی نہ کوئی نئی بات اس کو ایک نئے زخم سے نواز جاتی۔ سالگرہ پر سب دوستوں کو بلانے کی اجازت نہ ملی۔ شازیہ باجی کی شادی پر نہ جا سکا کہ دون بعد اس کا ٹیسٹ تھا۔ لوڈشیڈنگ میں گلدان ٹوٹ گیا اور اس کی پٹائی ہو گئی۔ تتلیاں پکڑنے پر اسے ماما کی جھڑکیاں سننا پڑیں..... تھا تو بہت کچھ مگر یہ سب کچھ وہ کہتا کس سے؟

آج اس کے ابو کو آنا تھا۔ وہ کچھ اداس بھی تھا۔ اور کچھ خوش بھی۔ اس نے ماما سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ابو کو لینے ایئرپورٹ جائے گا۔ لیکن اسکول آڑے آ گیا۔ مجبوراً اسے اسکول کے لئے تیار ہونا پڑا۔ سو اس میں خوشی کی جو ذرا سی رمق باقی تھی وہ بھی ختم ہو گئی اور وہ بوجھل دل کے ساتھ اسکول چلا گیا۔

تفریح کے دوران وہ کینٹین سے برگر لے کر بینچ پر آ بیٹھا۔ دوسرے لڑکے کھیل رہے تھے۔ وہ سوچ کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ برگر ختم ہونے کو تھا کہ اچانک اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا۔ یوں لگا جیسے پیٹ کے بائیں طرف پسلیوں کے ذرا نیچے کوئی اندر سے گوشت مروڑ رہا ہو۔ پہلے وہ درد سے دہرا ہوا۔ پھر اس کی چیخ نکل گئی۔ پاس کھیلتے ہوئے فرہاد اور امین اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے کراہنے کی وجہ پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ بتانے کے قابل ہی کب تھا؟ وہ مسلسل چیختا اور درد سے دہرا ہوتا رہا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو اطلاع ملی۔ انہوں نے فوراً اسے کلینک پہنچانے کا بندوبست کیا۔ جہاں سے اسے ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ اس کے گھر بھی اطلاع کر دی گئی تھی۔

وہ بیڈ پر سویا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے نیند کا انجکشن دیا تھا۔ تشخیص کے مطابق اس کا بایاں گردہ

ناکارہ ہوچکا تھا۔ نامعلوم جراثیموں نے اس تیزی سے اپنے قدم گاڑے تھے کہ دایاں گردہ بھی صحیح طور پر کام نہیں کر رہا تھا۔

وہ غنودگی کے عالم میں تھا جب اس کے کانوں سے ڈاکٹر کے یہ الفاظ ٹکرائے۔ "ان کے گردے ناکارہ ہیں..... کم از کم ایک گردے کا بندوبست کرنا لازمی ہے....." اور اس کے بعد آنے والی چیخ اس کی ماما کی تھی۔ وہ مزید کچھ نہ سن سکا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی چیز ہلچل مچا رہی تھی..... کون دے گا اسے اپنا گردہ.....؟ کیا اس کی جان بچ جائے گی..... کیا وہ دوبارہ اپنے گھر..... اپنے کمرے میں جانے کے قابل ہو گا.....!

جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے ابو، ڈاکٹر اور نرسیں نظر آئیں۔ کیا وہ زندہ بچ گیا ہے.....؟" خوشی کی لہر اس کے چہرے پر ابھری "ماما کہاں ہیں؟" اس نے سوال کیا اس کے ابو نے کچھ کہنے کی بجائے صرف اپنی انگلی دائیں طرف گھمائی۔ رانا نے نظریں ادھر کیں تو حیرت زدہ ہو گیا۔ اس کی ماما ساتھ والے بیڈ پر لیٹی تھیں۔

"او خدایا....." وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی ماما اسے اپنا گردہ دے کر نئی زندگی بخشیں گی۔ اس کے کانوں میں وہ الفاظ گونج رہے تھے جو وہ ماما کی غیر موجودگی میں ان کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ اس کا ہر خیال، ہر تصور غلط ثابت ہوا تھا۔ اس کی ماما ظالم نہیں تھیں۔ نہ ہی سنگ دل۔ وہ تو بے حد مہربان تھیں اور اپنے بیٹے سے بے حد پیار کرنے والی اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھنے والی! اس کی نگاہیں ندامت کے جھک گئیں آنکھوں سے دو آنسو موتیوں کی طرح گالوں پر لڑھک گئے۔

اس کے ابو آگے بڑھے، اس کا ہاتھ تھاما، ماتھے پر بوسہ لیا اور کہا "بیٹے! ہمیں آپ سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں..... صرف مصروفیات ہی جذبات کے اظہار کا موقع نہیں دیتیں۔ وہ دیکھیں....." فضلو، ان کے گھر کا ملازم، نئی سرخ رنگ کی چمکتی ہوئی سائیکل لئے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ رانا کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں کہ اسے اپنی کلائی پر بوجھ سا محسوس ہوا۔ اس نے دیکھا تو سنہری چین والی خوبصورت جگ مگ کرتی گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے ندامت اور شکرانے کے جذبات سے بھری ہوئی نگاہوں سے اپنے ابو کی طرف دیکھا اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"میں غلطی پر تھا..... ابو..... ابو..... غلطی میری تھی..... میں..... میں اب کبھی ایسا نہیں سوچوں گا..... آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں نا..... صرف مجھ سے....." وہ نہ جانے کیا کیا کچھ کہے جا رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے رواں آنسو ابو کی قمیص میں جذب ہوتے جا رہے تھے۔

پرانے زمانے کے کپڑے

آصف فرّخی

زبان اور رسم و رواج کی طرح لباس بھی مختلف علاقے کے لوگوں کی شناخت کو واضح کرتا ہے۔ مختلف علاقوں کے لوگ اپنے اپنے پہناوے سے پہچانے جاتے ہیں۔ دنیا کی مختلف قوموں کے اپنے اپنے مخصوص لباس ہیں جو ان علاقوں کے گرم و سرد موسم، رہن سہن کے طریقے اور لباس کے لئے خام مواد کی فراہمی کے لحاظ سے رائج ہوئے ہیں۔ جن علاقوں میں زیادہ سردی پڑتی ہے وہاں کے لوگ گرم اور اونی کپڑے پہنتے ہیں۔ گریبان بند اور سر ڈھکا رکھتے ہیں۔ بلکہ قطب شمالی کے پاس کے علاقوں میں جہاں سال بھر برف جمی رہتی ہے۔ جانوروں کی پوستیں اور سمور عام طور پر پہنے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف گرم علاقوں میں کھلے کھلے اور ڈھیلے لباس عام ہیں، ہلکے اور ٹھنڈے رنگ پسند کئے جاتے ہیں۔ یہ لباس سادہ

ہوتے ہیں یا زرق برق بھی ہو سکتے ہیں۔ پہننے والے کی پسند کے علاوہ، اس کی عمر اور سماجی مرتبے کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔

معاشرے کی دوسری چیزوں کی طرح لوگوں کے پہننے کے کپڑے بھی زمانے کے ساتھ ساتھ بدلے ہیں۔ لباس کی تراش خراش اور فیشن کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔ آج جو کپڑے ہم پہنتے ہیں وہ آج سے سو سال پہلے کے لوگوں کو عجیب و غریب اور نامانوس معلوم ہوں گے۔ بالکل جس طرح ان لوگوں میں جس انداز کے کپڑے رائج تھے، وہ آج ہم پہن کر سڑک پر نکلیں تو شاید تماشا بن جائیں۔ ہر عہد دوسرے عہد کے لئے اسی طرح تماشا بن جاتا ہے۔

ہمارے آباو اجداد درختوں کی چھال اور جانوروں کی کھال سے اپنا تن ڈھانپتے تھے۔ جوں جوں تہذیب ترقی کرتی گئی، لباس تبدیل ہوتے رہے۔ تہذیب اور لباس میں اس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔

برصغیر کے علاقے کے لئے مخصوص کپڑے ہیں۔ یہ کپڑے آج سے نہیں، بہت پرانے زمانے سے دنیا بھر میں مشہور ہیں، اور ان کی تجارت ہو رہی ہے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ قدیم مصر کے باشندے اپنے مُردوں کو جس طرح کپڑے میں لپیٹ کر اہرام میں رکھتے تھے، تو ایسی ممیاں ملی ہیں جس کی تدفین میں استعمال ہونے والا کپڑا، اور کپڑے کو رنگنے کے لئے کام آنے والا نیل، قدیم ہندوستان سے آیا تھا۔ قدیم ہندوستان میں تیار کئے ہوئے کپڑے آشوریہ اور بابل کے علاوہ یونان اور روم میں بھی پسند کئے جاتے تھے۔ یہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے بھی کئی سو سال پہلے کی بات ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ پارچہ بافی کی صنعت اس علاقے میں ترقی کرتے کرتے درجۂ کمال تک پہنچ گئی۔ مؤرخ کہتے ہیں کہ برصغیر میں سوتی، ریشمی اور اُونی کپڑوں کی صنعت شروع سے اعلا درجہ کی رہی ہے بادشاہوں کے زمانے میں حریر، پرناں اور زربفت قیمتی کپڑے تھے۔ امیر خسروؒ نے اپنے عہد کے بعض کپڑوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ گلاب اور لالہ کی طرح دیدہ زیب ہوتے ہیں، بعض اتنے نازک اور باریک کے سوئی کے ناکے سے گزر جائیں۔ اسے محض شاعرانہ مبالغہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس عہد میں پارچہ بافی کی صنعت بہت ترقی کر چکی تھی۔ بنگال کے علاقے میں ایسی ململ تیار ہوتی تھی۔ کہ دنیا بھر میں اس کی مثال دی جاتی، اور جو دیکھتا، حیران رہ جاتا۔ ڈھاکہ کی ململ ایسی نفیس اور باریک ہوتی کہ اس کا پورا تھان انگوٹھی کے چھلے میں سے گزر سکتا تھا۔ یہ اتنی باریک ہوتی کہ اس کو سر پر لپیٹ لیا جاتا تو اس کے اندر سے سر کے سارے بال دکھائی دیتے۔ اس کی ایک قسم شبنم کہلاتی تھی، اور اس کا نام اس لئے پڑا کہ اگر اسے گھاس پر رکھ دیا جاتا تو اس کا شفاف رنگ گھاس میں چھپ جاتا۔

کہا جاتا ہے کہ جب برصغیر پر قابض ہونے والے انگریزوں نے پہلی مرتبہ اس کپڑے کو دیکھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں کر سکے، اور کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے ہواؤں کے تار سے پریوں نے بُنا ہے۔ مگر انہی انگریزوں کے ہاتھوں یہ صنعت تباہ ہوئی۔ انگلستان کے بنے ہوئے کپڑے کو فروغ دینے اور اپنی تجارتی بالادستی قائم کرنے کے لئے انہوں نے مقامی صنعت کی ہر ممکن حوصلہ شکنی کی۔ اور جب کچھ بس نہ چلا تو ماہرِ فن کاری گروں کے انگوٹھے اور انگلیاں کٹوا ڈالیں کہ وہ کپڑا نہ تیار کر سکیں۔

اس طرح بنارس کے ریشمی کپڑے، خصوصاً ساڑھیوں اور کشمیر کی گرم شالوں کی بھی دور دور تک شہرت تھی۔ یہ شہرت آج تک قائم ہے۔

کپڑے کی اقسام کی طرح، پرانے زمانے کے لباس بھی مخصوص تھے، اور اس زمانے کے رسم و رواج سے وابستہ تھے۔ مثلاً اب سے چند برس پہلے تک، بڑوں کے سامنے ننگے سر آنے کو بدتہذیبی سمجھا جاتا تھا۔ کیا بچے کیا بڑے، سبھی ٹوپی پہنتے تھے۔ کئی طرح کی ٹوپیاں رائج تھیں۔ اسی طرح عورتیں، غیر مردوں کے سامنے بے حجاب نہیں آتی تھیں، اور اپنے چہرے اور جسم پر برقعہ اوڑھ لیتی تھیں، اگر برقعہ نہ ہوتا تو ڈوپٹے سے گھونگھٹ نکال لیتیں۔

مردوں میں ٹوپی کے علاوہ، سر پر پگڑی باندھنے کا رواج بھی رہا ہے۔ نوابوں اور بادشاہوں کی پگڑی میں جواہرات ٹنکے ہوئے ہوتے۔ علماء کی پگڑی عمامہ کہلاتی ہے اور بادشاہوں کی پگڑی، دستار۔ پگڑی صرف سر پر پہننے کا کپڑا نہیں، بلکہ عزت اور وقار کی علامت سمجھی جاتی رہی۔ پگڑی کی یہ اہمیت دہلی کے سلاطین سے لے کر آج تک قائم ہے۔

مغلوں کے دور میں جامے کا رواج تھا، جو گھٹنوں تک یا اس سے اور ذرا نیچے تک سلوایا جاتا۔ مغل دربار میں جامہ نیم آستین یا نیم تنہ کا رواج تھا۔ یہ آدھی آستین کا لباس تھا، جس میں سامنے کی طرف گھنڈیاں لگی ہوئی ہوتیں۔ اس میں گریبان کے بجائے دو کنارے ہوتے، جو "پردہ" کہلاتے اور سینے کو ڈھانک لیتے۔ نچلا حصے کو کھلا رکھتے اور کمر کے پاس اسے ایک اور لباس سے جوڑ دیتے جو ٹخنوں تک آتا، اس میں چنٹ دی جاتی اور اس کا گھیر بڑا سا ہوتا۔ جامے سے انگرکھا بنا۔ انگرکھے میں گریبان بھی ہوتا تھا اور اس میں گلے کے نیچے ایک پٹی سی ہوتی جو دوسری طرف گردن کے پاس ایک گھنڈی یا ٹکمنے سے اٹکا دی جاتی۔ اس کی آستینیں چنٹ والی ہوتیں، اور دامن نیچے تک آتا۔ اچکن اور شیروانی اسی انگرکھے کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔

کمر کے گرد پٹکا بھی باندھا جاتا۔ اس پر سونے چاندی کا کام یا نقاشی ہوتی۔ موزے پہننے کا رواج عام تھا۔

عورتوں میں ڈوپٹے کا رواج بہت پرانا ہے۔ پرانے زمانے کا دوپٹہ تین گز کا ہوتا۔ سر پر اوڑھا جاتا اور گھٹنے تک آتا۔ ملکہ نور جہاں نے دوپٹے کی ایک قسم "اوڑھنی" ایجاد کی جو زیادہ لمبی نہ ہوتی اور بہت ہلکی ہوتی۔ عورتوں کے لباس میں کئی طرح کے پاجامے شامل تھے۔ بعض ڈھیلے ڈھالے ہوتے جو ٹخنوں پر چنٹ دے کر باندھ دیئے جاتے۔ بعض تنگ مُہری کے ہوتے جن کا گھیر اوپر سے ڈھیلا ڈھالا ہوتا۔ ایک زمانے میں اتنی تنگ مہری کے پائینچوں کا رواج ہو گیا کہ پہننے کے بعد مہریاں کس کر سی لی جاتیں اور اتارتے وقت ٹانکے توڑنے کی ضرورت پڑتی۔ بعد میں گھیر دار پاجامے کی جگہ کلیوں والے پاجامے کا رواج ہو گیا۔ اس کے بعد غرارہ مقبول ہوا۔ بعض مرتبہ غرارہ اتنا گھیر دار ہوتا کہ کنیزیں اس کو اٹھائے رہتیں۔

عورتوں کے لباس میں عام طور سے بیل بوٹے، کشیدہ کاری، گوٹا ٹھیا، کام دانی، کارچوبی، یا زر دوزی کا کام ضرور ہوتا۔ اس وجہ سے یہ لباس عام طور سے قیمتی ہوتے تھے۔ زیور اور سنگھار اس کے علاوہ ہیں

چشمِ تصور

ترجمہ
اسد محمود راؤ

ہنری اس وقت اپنے مکان کی ایک کھڑکی میں کھڑا بچوں کے کھیل کے میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس میدان میں روزانہ بچے فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ اس وقت بھی بچوں کی دو ٹیموں کے درمیان ایک میچ جاری تھا۔ نوعمر لڑکے بڑے جوش و خروش سے مقابلے میں مصروف تھے۔

کھیل کا نظارہ کرتے کرتے ہنری کی چشم تصور اسے کسی اور ہی مقام پر لے گئی۔ یہ باکس فورڈ پارک کا میدان ہے جہاں ملک کی سب سے بڑی ٹیموں اور بین الملکی ٹیموں کے مابین مقابلے ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی ایک بین الاقوامی میچ جاری تھا۔ کھیل انتہائی ڈرامائی مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ تماشائیوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ اور ہر لمحے داد و تحسین کا ایسا غلغلا بلند ہوتا تھا جیسے

میدان کارزار گرم ہو۔ داد و تحسین کا یہ قیامت خیز شور ٹیموں کے لئے نہیں تھا، صرف ایک کھلاڑی کے لئے تھا جس نے فٹ بال کی دنیا میں تہلکہ مچایا ہوا تھا جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے فٹ بال کے شائقین بے تاب رہتے تھے اس کھلاڑی کا نام تھا ہنری سیمسن۔

اس وقت بھی میچ کانٹے کا تھا اور ہنری کی ٹیم کی فتح کا دارومدار ہنری پر ہی تھا ہر فرد کی توجہ کا مرکز اس وقت ہنری ہی تھا اور وہ فیصلہ کن گول کرنے کے لئے حیرت انگیز پھرتی اور بے مثال مشاقی سے فٹ بال لئے مخالف ٹیم کے تمام کھلاڑیوں کو ڈاج دیتے ہوئے ڈی کی طرف جا رہا تھا..... اور پھر..... بالآخر اس نے اپنے مشہور عالم اسٹائل میں بال کو کک لگائی اور فیصلہ کن گول ہو گیا..... تماشائیوں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ جوش و خروش سے دیوانے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ہنری کی ٹیم کے کھلاڑیوں نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور خوشی سے میدان میں رقص کرنے لگے۔

دفعتاً ایک آواز نے ہنری کو چونکا دیا۔ "کیا تم پھر جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہے ہو ہنری؟" اس کی بیوی تیکھی آواز میں کہہ رہی تھی۔

وہ اچھل پڑا اور مڑ کر بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے ہکلایا۔ "نہیں..... وہ..... میں تو لان کا جائزہ لے رہا تھا۔ کافی کاٹھ کباڑ جمع ہو گیا ہے لان کو صفائی کی ضرورت ہے۔"

"صفائی اور حلیہ درست کرنے کی تو تمہیں ضرورت ہے" ہنری کے بال بکھرے ہوئے شیو بڑھا ہوا اور کپڑے شکن آلود تھے۔

اس کی بیوی قدرے بے رحمانہ لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اگر تم یہاں کھڑے کھڑے اسی طرح جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے رہے تو آج پھر ڈیوٹی پر تاخیر سے پہنچو گے۔"

ہنری یہ سن کر فوراً اپنے کپڑے بدلنے لگا۔ کپڑے بدل کر اس نے اپنے پائنچوں پر ربڑ بینڈ چڑھایا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ ربڑ بینڈ اس نے اس لئے چڑھائے تھے کیونکہ وہ سائیکل پر اسپتال جاتا تھا جہاں اس کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ سائیکل پر بیٹھ کر وہ سڑک کے کنارے کنارے چل دیا۔ کچھ دور جا کر ایک سگنل پر اسے سائیکل روکنا پڑی۔ اسی دوران جدید ماڈل کی ایک اسپورٹس کار اس کے برابر آ کر رک گئی۔ وہ اسی قسم کی کاروں میں سے تھی جو پہلا گیئر لگتے ہی تین چار سیکنڈ کے اندر اندر ساٹھ ستر کی اسپیڈ سے دوڑنے لگتی ہیں۔

تصور ہی تصور میں ہنری نے دیکھا کہ اس کا جسم چیتے کی طرح بل کھا کر ایک خاص زوایئے پر

آیا اور سگنل کھلتے ہی اس کی سائیکل آندھی اور طوفان کی طرح آگے بڑھی اور سڑک پر موجود ہر گاڑی کو پیچھے چھوڑتی چلی گئی اور وہ مختلف سواریوں کے درمیان سے لہراتا ہوا تقریباً اڑا چلا جا رہا تھا۔

وہ حقیقت کی دنیا میں واپس آیا تو اس کے برابر کھڑی ہوئی اسپورٹس کار غائب تھی اور سگنل ایک بار پھر سرخ ہو چکا تھا۔ سڑک کے کنارے کھڑا ہوا ایک لڑکا جو اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ "تیسری بار سگنل سبز ہو تو آپ ہمت کر کے چوراہا عبور کر ہی لیجئے گا۔"

ہنری اس لڑکے کی بات سنتے ہی ایک بار پھر خوابوں کی دنیا میں چلا گیا اس نے دیکھا کہ وہ اس لڑکے کا ٹیچر ہے جو ابھی چند لمحے پہلے استہزائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کلاس لگی ہوئی تھی اور ہنری اس لڑکے کو اشارے سے بلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "ذرا یہاں آؤ برخوردار تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم بڑے ہو کر نامی گرامی بدمعاش بنو گے۔ کم از کم یہ مسکراہٹ ہی منہ سے ہٹا لو اور یہاں آؤ اور بلیک بورڈ پر سو بار اسم کی تعریف لکھو۔" تصور ہی تصور میں یہ مکالمے ابھی ہنری کے ہونٹوں پر تھے کہ ایک جھٹکے سے اسے حقائق کی دنیا میں واپس آنا پڑا وہ ایک شخص سے ٹکرایا گیا تھا جو بیچارا بڑے اطمینان سے سڑک کراس کر رہا تھا ہنری اس ٹکر کے نتیجے میں تقریباً گر ہی گیا تھا۔ اس شخص نے ہنری کو گریبان سے پکڑ کر ہوا میں اٹھا لیا اور غرایا۔

"اس حرکت کا مقصد تو بتاؤ ذرا۔"

"میں..... میں معافی چاہتا ہوں۔" ہنری منمنایا "میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔"

"اگر تم دن کی روشنی میں ساڑھے چھ فٹ کے ایک آدمی کو نہیں دیکھ سکتے تو فوراً اندھوں کی انجمن کے صدر کا عہدہ سنبھال لو" وہ شخص گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے اسے واپس سڑک پر کھڑا کرتے ہوئے بولا۔

"اس سے پہلے کہ مجھے غصہ آئے میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔"

یہ سنتے ہی ہنری تیزی سے سائیکل کے پیڈل گھماتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ چشم تصور میں وہ ایک رنگ میں اسی شخص سے مقابلے میں مصروف تھا اس نے آگے بڑھ کر ہنری کے لیفٹ ہک مارنا چاہا لیکن ہنری نے جھکائی دیتے ہوئے اس کے جبڑے پر رائٹ ہک رسید کیا جس نے ہتھوڑے کا کام دیا۔ وہ شخص لڑکھڑایا اور تماشائیوں کا شور بلند ہوا۔ ہنری نے فوراً اس کی کنپٹی پر ایک گھونسا رسید کیا۔ بس مقابلے کا فیصلہ ہو گیا وہ شخص ناک آؤٹ ہو گیا۔ اس لمحے اسے فوراً بریک لگانا پڑے۔ کیونکہ وہ اسپتال کے اسٹینڈ پر پہنچ چکا تھا اور ایک دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔ سائیکل کو اس کی

مخصوص جگہ پر کھڑا کر کے اسپتال کی شاندار عمارت کی جانب بڑھ گیا۔

صدر دروازے سے اندر داخل ہو کر وہ ریسپشن کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ لاؤنج میں ایک میاں بیوی غالباً کسی ڈاکٹر کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ہنری ان کے سامنے سے گزرا تو شوہر نے بیوی سے سرگوشی نما لہجے میں پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ یہ کون ہے ؟"

"کون ہے ؟" بیوی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہنری سیمسن ۔ دماغی امراض کا ماہر ملک کا سب سے بڑا اور مشہور ڈاکٹر" شوہر نے بتایا۔

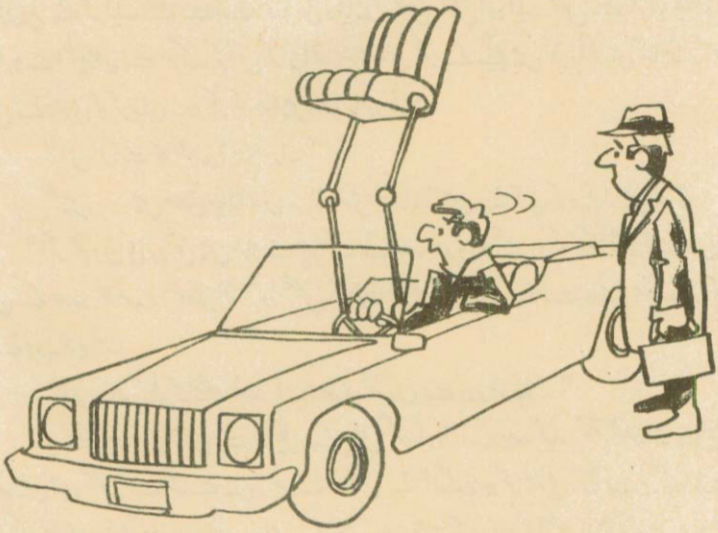

ابھی تو یہیں تھے

ڈیورا سرکس میں کرتب

سفیان ناصر

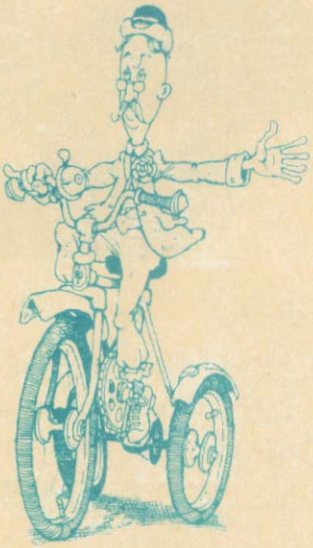

ولاڈیمر ڈیورا ..... جی ہاں یہ صاحب روسی تھے اور آج سے پچھتر سال قبل سرکس میں مختلف قسم کے کرتب دکھایا کرتے تھے ایک دن ان کو ایک عجیب و غریب خیال آیا۔ جانوروں کو کرتب سکھانے کا خیال اِس مقصد کے لئے انہوں نے ماسکو میں ایک گھر خریدا اور اسی گھر میں جانوروں کو مختلف کرتب سکھانے لگے۔ "ولاڈیمر ڈیورا" کا یہ گھر آہستہ آہستہ ایک سرکس کی صورت اختیار کر گیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی نواسی نے اس سرکس کو مزید وسیع کیا۔ مس ڈیورا جنہیں "ناٹیلہ ڈیورا" کہا جاتا تھا انہوں نے اس سرکس میں ایسا سماں پیش کیا کہ جو کوئی ایک مرتبہ وہاں آجاتا تھا "سرکس تھیٹر" سے واپس جانے کا نام نہ لیتا تھا۔ اس سرکس تھیٹر میں جانوروں کو لانے سے پہلے "ڈیورا اسکول" میں باقاعدہ تربیت دی جاتی

ہے۔ اور ان جانوروں کو مختلف "کرتب" اور "گُر" مس نائیلہ ڈیورا سکھاتی ہیں۔

"ڈیورا سرکس تھیٹر" میں مختلف جانوروں کی تعداد چار سو کے قریب ہے۔ اس تھیٹر میں پالتو جانور مثلاً کتے بلیاں مرغے وغیرہ کے علاوہ قیمتی جانوروں کو بھی تربیت دی جاتی ہے۔ ان جانوروں کو کرتب سکھانے کے علاوہ ایک اچھے "اسپورٹس اینمل" کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔

"ڈیورا" کے جانور مختلف فلموں میں بھی پرفارمنس دے چکے ہیں۔ ان بے زبان جانوروں نے مختلف فلموں میں اتنا اچھا اور دل میں اثر پیدا کرنے والا کام کیا کہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے..... عام دنوں میں جب تھیٹر کا آغاز ہوتا ہے تو یہی جانور عجیب و غریب کھیل پیش کر کے تھیٹر کے شائقین کو محفوظ کرتے رہتے ہیں مثلاً ایک بندر زرق برق لباس پہن کر بکرے کی پیٹھ پر بیٹھ کر پورے سرکل کا چکر لگاتا ہے اور مجال ہے کہ وہ بکرے کی کمر سے گر جائے۔ وہ بکرے پر اس طرح بیٹھتا ہے جیسے وہ گھڑ سوار ہو۔ اس کے علاوہ ایک ہی میز پر لومڑی اور مرغا بیٹھ کر پانی پیتے ہیں۔ مرغے کو اس طرح سدھایا گیا ہے کہ وہ لومڑی سے ڈرتا تک نہیں ہے۔ اتنی ہی حیرت اس پر ہوتی ہے کہ لومڑی مرغے کو اپنا شکار نہیں بناتی اور ایک ہی گھاٹ پر شیر اور بکری کے پانی پینے والے مقولے کو صحیح ثابت کر دیا جاتا ہے۔ حیرتوں کے یہ سلسلے اس وقت مزید بڑھ جاتے ہیں جب چوہا اپنی ازلی دشمن بلی کے ساتھ ایک جھولے پر بیٹھ کر بڑے مزے سے جھولا جھولتا ہے۔ اور بلی صاحبہ کے منہ سے چوہے کو دیکھ کر رال نہیں ٹپکتی۔

ان سب کرتبوں کو دیکھنے کے بعد ان سکھانے والوں کو داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ ڈیورا سرکس، واقعی دلچسپ اور حیرتناک سرکس ہے جہاں جاکر دل سے دعا نکلتی ہے کہ کاش ساری دنیا میں اس سرکس کی طرح امن و شانتی ہو جائے۔

"وہ ان جانوروں کے کرتب دیکھیں اور ان سے پیار محبت کا درس حاصل کریں جانور اور انسان میں دوستی اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان جانوروں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔"

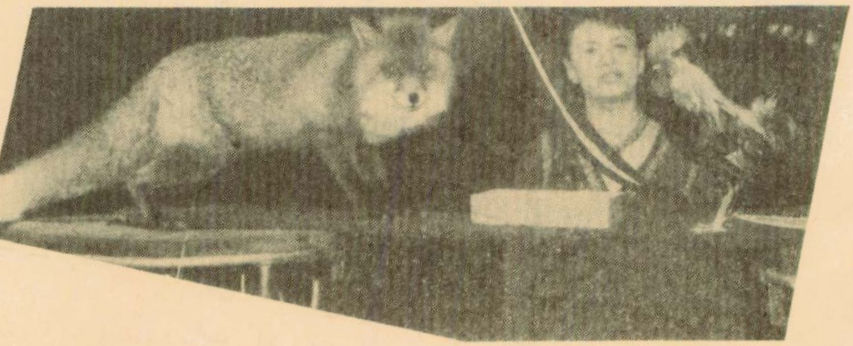

بگلا پکڑنے کی ترکیب

عبدالقادر۔ نیو کراچی

اِک شخص نے جاکر کسی دانا سے یہ پوچھا
کیا آپ بتائیں گے مجھے حل کوئی اچھا؟
بگلے کو پکڑنے کا مرے دل میں ہے ارماں
ترکیب مجھے اس کی بتا دیجئے آساں
دانا نے کہا سوچ کے تُو ہے بڑا پگلا!
آسان سی ترکیب ہے، مل جائے گا بگلا
در پر مرے حاضر ہوا دانائی یہی کی
ہے سب کے مسائل کی مرے پاس ہی کنجی
جب بھی کوئی آتا ہے مرے پاس سوالی
ہر گز وہ پلٹتا نہیں دامن لیے خالی
حل اپنا ہر اک آدمی پاتا ہے مجھی سے
ہر درد کا درماں لئے جاتا ہے مجھی سے
نسخہ کوئی بن مانگے بتایا نہیں جاتا
حکمت کا خزانہ ہے، لٹایا نہیں جاتا
دیکھو جوں ہی بگلے کو کھڑا گھات لگائے
دریا کی طرف رخ کئے، اک ٹانگ اٹھائے
اک موم کا ٹکڑا لئے چپکے سے پہنچ جاؤ
سر پر اسے بگلے کے رکھو اور پلٹ آؤ
پگھلائیں گی اس موم کو سورج کی شعاعیں
بہتا وہ چلا جائے گا ڈھک جائیں گی آنکھیں
بگلے کو ذرا سا بھی نظر آ نہ سکے گا
ہو جائے گا مجبور کہیں جا نہ سکے گا
یوں اندھا بنے گا تو بہت ہوگا پریشاں
تب جاکے پکڑ لینا اسے کام ہے آساں

میں نے تمہیں کیا خوب یہ ترکیب بتائی
اب لاؤ ذرا جلد سوا سیر مٹھائی

انعامی لطیفہ

ایک اسکول انسپکٹر معائنے کے لئے ایک کلاس میں آئے۔ انہیں شکایت ملی تھی کہ اس اسکول کے بچے بہت جھوٹ بولتے ہیں۔ انہوں نے ایک لڑکے سے کہا "تم ایک خوبصورت جھوٹ بولو میں تمہیں پانچ روپے انعام دوں گا۔"

لڑکا بولا "ابھی تو آپ دس روپے کہہ رہے تھے اب پانچ روپے کہہ رہے ہیں۔"

(محمد انعام فاروقی۔ اسلام آباد)

استاد (اشرف سے) تم کھڑے ہو کر بتاؤ کہ روئی کسے کہتے ہیں؟

اشرف ..... مجھے نہیں پتا۔

استاد ..... اچھا تمہارا کوٹ کس چیز سے بنا ہوا ہے۔

اشرف ..... میرے ابو کے کوٹ سے۔

(آمنہ عاصم، کوئٹہ)

ایک آدمی نے ایک بچے سے کہا کہ "ذرا یہ رومال تو سونگھنا اس میں سے کیسی خوشبو آرہی ہے۔" بچہ بولا، "مجھے پتہ ہے جب میں یہ سونگھوں گا تو بے ہوش ہو جاؤں گا اور آپ مجھے اٹھا کر لے جائیں گے۔" آدمی بولا "اچھا یہ چاکلیٹ تو کھا کر دیکھو۔" بچہ بولا "مجھے پتہ ہے کہ اس کے کھاتے ہی میں بے ہوش ہو جاؤں گا اور آپ مجھے بوری میں بند کر کے لے جائیں گے۔"

آدمی (حیرت سے) تمہیں کیسے پتا چلا؟

بچہ بولا "میرے ابو نے مجھے بتایا تھا۔"

"اچھا تمہارے والد کون ہیں؟" آدمی نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں کیونکہ وہ مجھے بوری میں بند کر کے کہیں سے لائے تھے۔"

(عمران احمد جمیل، لاہور)

ایک صحافی نے ایک سابق فوجی کا انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا "آپ کو یہ زخم کیسے آئے؟"

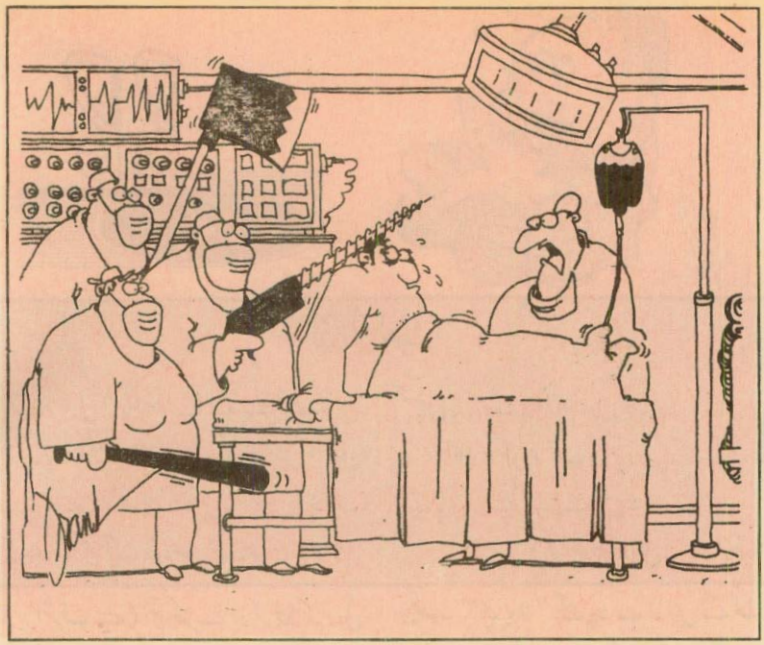

آپ اپنے اوپر کسی طرح کا دباؤ تو محسوس نہیں کر رہے ؟

فوجی۔ ”جنگ عظیم دوئم کے دوران برما کے محاذ پر میرے قریب ایک بم گرا تھا۔“

صحافی۔ ”تو کیا وہ بم پھٹ گیا؟“

”نہیں، اس نے گھر تک میرا پیچھا کیا اور کاٹ کر بھاگ گیا۔“ فوجی نے جل کر جواب دیا۔

(مرسلہ، کمیل شوکت۔ کراچی)

ایک کسان نے اپنے کھیت پر جال لگایا اور بہت سے پرندوں کے ساتھ ایک بگلا بھی پکڑا گیا۔ کسان جب بگلے کو حلال کرنے لگا تو بگلا بولا کہ تم مجھے نہ حلال کرو کیونکہ تمہیں پتہ ہے کہ میں بگلا ہوں اور ویسے بھی میرا بڑا نام ہے اور یہ میری غذا بھی نہیں ہے۔ کسان کہنے لگا کہ وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اس وقت تم بدمعاش پارٹی کے ساتھ پکڑے گئے ہو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔

یاسمین ناز، کراچی۔

امریکی صدر کولج نے ایک مرتبہ ورمانٹ کے علاقے سے تعلق رکھنے والے اپنے چند دوستوں کو وہائٹ ہاؤس میں کھانے کی دعوت دی۔ امریکی صدر کے یہ دوست بڑے لوگوں کے کھانے پینے کے آداب سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے

فیصلہ کیا کہ وہ کھانے کی میز پر صدر کولج کی نقل کریں گے۔

کھانے کا مرحلہ بخیر و خوبی گزر گیا اور میز پر کافی رکھی گئی۔ صدر کولج نے ایک پرچ لی اور اس میں تھوڑی سی کافی انڈیلی۔ صدر کی نقل کرتے ہوئے ان کے مہمانوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد صدر نے کافی میں چینی اور کریم ملائی۔ مہمانوں نے بھی نقل کی۔ مگر مہمانوں کو اس وقت بڑی مشکل پیش آئی اور وہ انتہائی پریشان ہوئے۔ جب صدر نے کافی سے بھری ہوئی پرچ فرش پر رکھ دی اور اپنی پالتو بلی کو بلانے لگے۔

(ستارہ انجم شیخ، ٹنڈو آدم)

ایک بچہ (اپنے انکل سے) انکل! انکل۔ کل میں بازار سے صابن کی ایک ٹکیہ لایا۔ اس سے اپنی شرٹ

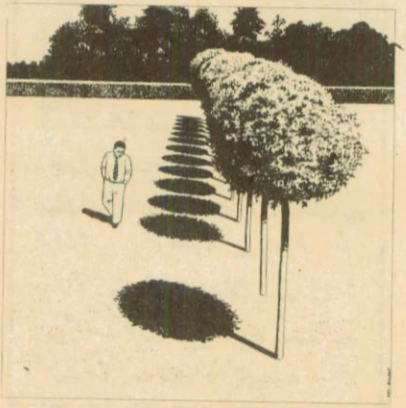

دھوئی تو وہ سکڑ کر چھوٹی ہوگئی۔ بتایئے اب میں کیا کروں؟

"ایسا کرو۔ (انکل کچھ سوچتے ہوئے بولے) تم بھی اسی صابن سے نہا لو۔"

(محمد انعام فاروقی۔ اسلام آباد)

ایک صاحب بڑی تیزی سے گھر میں داخل ہوئے۔ دروازہ جلدی سے بند کیا۔ اپنی بیگم کو کمرے میں لے گئے اور بولے "دروازے اور کھڑکیاں سب جلدی سے بند کر دو۔ کھڑکیوں کے پردے گرا دو۔ بتی بند کر دو۔ جلدی!"

بیگم نے ان کے حکم کی تعمیل کی تو وہ صاحب اپنی بیوی کو کمرے کے ایک کونے میں لے گئے اور اپنی کلائی آگے کرتے ہوئے بولے "دیکھو بیگم میری نئی گھڑی اندھیرے میں چمک رہی ہے۔"

(نثار احمد سومرو۔ ہرنائی)

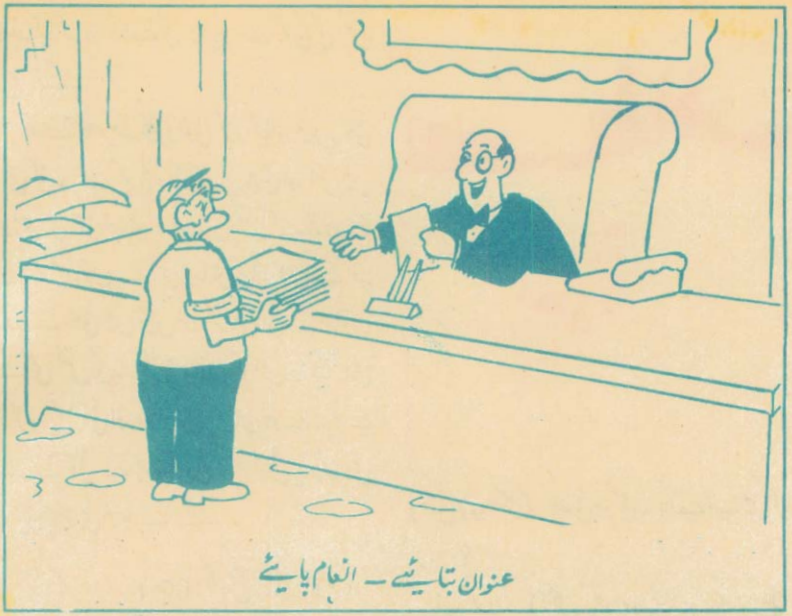

عنوان بتایئے ۔ انعام پایئے

جنرل اسٹور کے مالک نے نئے ملازم کو پہلے ہی روز اپنے گودام میں لے جا کر کہا۔ "تمہیں اس سارے سامان کی فہرست تیار کرنی ہے۔" سہ پہر کے وقت جب مالک دوبارہ گودام پہنچا تو نوجوان ایک بوری کھولے بیٹھا ہے۔ "کیوں میاں کہاں تک پہنچے؟" مالک نے پوچھا۔

نوجوان نے جواب دیا۔ "جناب ابھی تو پہلی بوری سے فارغ ہوا ہوں اس میں کل انیس ہزار آٹھ سو مونگ پھلیاں ہیں۔"

مرسلہ۔ اعجاز علی شیخ ..... سکھر

استاد ۔ بھائی چارے کو جملے میں استعمال کرو۔

شاگرد ۔ "اکرم نے جب دودھ والے سے پوچھا کہ بھیا دودھ اتنا مہنگا کیوں بیچتے ہو تو وہ بولا بھائی چارہ جو مہنگا ہو گیا ہے۔"

(مظہر شہنیم راجا۔ جھڈو)

آپ کی حسِ مزاح کا امتحان!!

ماہ نامہ آنکھ مچولی میں اب تک شائع ہونے والے لطائف ساتھیوں کی ڈاک سے منتخب کر کے شائع کئے جاتے تھے۔ آئندہ ماہ سے لطیفوں کی اشاعت کا طریقہ بدل دیا گیا ہے۔

اب کوئی بھی قاری بہت سے منتخب لطائف اکٹھے بھجوا سکتا ہے۔ اس طرح لطائف کا پورا سیکشن اُسی مراسلہ نگار کے نام سے شائع ہو گا جس نے سب سے بہتر لطیفے بھجوائے ہوں گے یکمشت بہت سے لطیفے بھجوایئے اور نام کے علاوہ انعام بھی پایئے۔

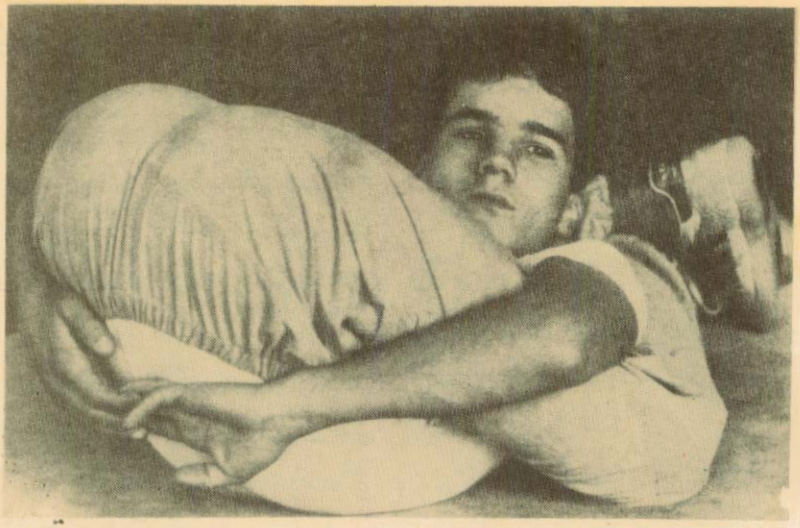

سستی کاہلی کی دشمن ورزش

سلجد سعید

کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا جسم متناسب، خوبصورت اور چاق و چوبند رہے اور آپ کے جسم کی طاقت اور قوتِ برداشت میں اضافہ ہو جائے۔ آپ میں سے ایسا کون شخص ہو گا جو یہ نہیں چاہے گا تو پھر ذرا سوچئے کہ ایسی کون سی چیز ہے جو ان تمام چیزوں کو ہمارے اندر پیدا کر سکتی ہے۔ جی ہاں آپ نے صحیح پہچانا۔ ورزش..... ورزش کے بارے میں یہ آپ نے یقیناً کتابوں وغیرہ میں پڑھا ہو گا یہاں ہم آپ کو اُن ہلکی پھلکی ورزشوں کے بارے میں بتائیں گے جو آپ اپنے کسی قریبی باغ یا گھر کے لان میں با آسانی کر سکتے ہیں۔

اس جدید دور میں مشینوں کی بہتات نے ہم لوگوں کو آرام طلب بنا دیا ہے۔ آج کا انسان دماغی محنت تو زیادہ کر لیتا ہے اس کے برعکس اس سے جسمانی محنت نہیں ہوتی۔ اسی لئے دل، معدے اور پیٹ کی بیماریاں، پٹھوں کا درد ہمارے ہاں عام ہے۔ اچھی صحت کے لئے جہاں ہم غذا کو اہمیت دیتے ہیں وہاں اگر ہم اپنا تھوڑا سا وقت ورزش کے لئے بھی نکال لیں تو ہماری زندگی بڑی متوازن ہو سکتی ہے۔ ورزش سے نہ صرف انسان کی قوت مدافعت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اس کے اندر جسمانی دباؤ اور اعصابی کھنچاؤ کو برداشت کرنے کی

اہلیت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ لوگ جو اندھا دھند کھانے کو اپنی عادت بنا لیتے ہیں بہت سی موذی بیماریوں کو اپنے گلے لگا لیتے ہیں۔ اگر وہ صحت مند غذا کے ساتھ تھوڑی ورزش کو بھی اپنا روزانہ کا روٹین بنالیں تو جسم میں موجود حرارے چربی بننے کے بجائے عضلات کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اب اگر آپ ورزش کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوگئے ہیں تو ورزش کے لئے ایک وقت مقرر کر لیجئے۔ ورزش کے لئے سب سے بہتر وقت صبح ناشتے سے پہلے کا وقت ہوتا ہے..... اور ہاں یہ بھی یاد رکھئے ورزش کرتے وقت توازن قائم رکھنا لازم ہے مثلاً ایسی ورزشیں کرنی چاہئیں جن سے جسم کے تمام اعضاء کی ورزش ہوسکے جیسے پیٹ، کمر، ٹانگوں، پھیپھڑوں، بازوؤں، سینے اور گردن وغیرہ کی۔ ان تمام اعضاء کے لئے علیٰحدہ ورزشیں ہیں۔ ورزش ہمیشہ آہستہ آہستہ شروع کرنی چاہئے جلد بازی اور تیزی سے آپ کے جسم کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ہم یہاں ان تمام ورزشوں کا احاطہ تو نہیں کر سکتے البتہ چند ایسی ورزشوں کا تذکرہ ضروری سمجھیں گے جو آسانی سے آپ کر سکتے ہوں۔

پیدل چلنا بھی ایک ورزش ہے۔ اگر آپ کا اسکول قریب ہے تو بجائے سواری کے پیدل چل کر اسکول جایئے اس کے علاوہ بھی پیدل چلنے کو ترجیح دیں۔ ورزش کرنے کے بعد جب آپ غسل کریں بدن سے پانی خشک کرتے ہوئے تولیئے کو جسم پر آہستہ آہستہ رگڑیں اس سے رگوں اور پٹھوں میں خون کی گردش تیز ہوجاتی ہے۔ بیٹھتے وقت اسکول کی ڈیسک ہو یا گھر کی کرسی ہمیشہ تن کر بیٹھئے۔ بیٹھتے وقت کمر کو سیدھا رکھیں گردن جھکا کر نہ بیٹھیں اس سے بازوں اور پٹھے مضبوط ہوتے ہیں۔

آیئے اب ہم آپ کو چند ایک ایسی ورزشیں بتائیں جن پر عمل کر کے آپ اپنے اندر بہت سی تبدیلیاں محسوس کریں گے۔

۱۔ خون جسم کا ایک نہایت اہم رکن ہے خون اگر صاف ہے تو چہرے پر شادابی اور خوبصورتی جھلکتی ہے اور خون صاف نہ ہو تو چہرے پر دانے، پھنسیاں اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ خون کو صاف رکھنے کے لئے تازہ ہوا بہت ضروری ہے۔ ہمارے ہر سانس میں ایک زہریلی گیس کاربانک ڈائی آکسائیڈ خارج ہوتی ہے۔ اس کے بدلے ہماری ناک کے نتھنوں کے ذریعے تازہ ہوا ہمارے پھیپھڑوں میں جاتی ہے تازہ ہوا حاصل کرنے کے لئے اپنے دائیں پاؤں کو بائیں ران پر اور اپنے بائیں پاؤں کو دائیں ران پر رکھیں اس کے بعد دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر اور بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر رکھیں اور تن کر بیٹھ جائیں اس کے بعد سامنے نظر رکھتے ہوئے سانس اندر کھینچیں اور چند لمحوں بعد اس کو باہر چھوڑ دیں۔ روزانہ صبح ناشتے سے پہلے کھلی فضا میں اس طرح پندرہ بیس مرتبہ کرنے سے آپ کا پھیپھڑہ تازہ ہوا سے بھرا رہے گا۔

۲۔ دونوں پاؤں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر رکھیں اب دونوں بازوؤں کو اپنے سر کے اوپر اٹھا لیں اور پھر آہستہ آہستہ جھکتے ہوئے فرش کو چھونے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد واپس اوپر کی طرف اٹھتے ہوئے پیچھے کو جھکیں اس طرح کئی بار کریں۔ اس ورزش سے آپ کی کمر اور پیٹ کے عضلات (Muscles) مضبوط ہوتے ہیں۔

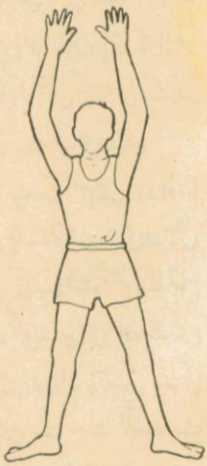

۳۔ ہمارے ہاں پیٹ کی بیماریاں عام ہیں۔ زہریلی غذا ہضم کرنے اور پیٹ کی بیماریوں سے بچنے کے لئے آپ روزانہ صبح دونوں ہاتھ زمین پر رکھیں، کہنیوں کو پیٹ سے لگائیں اب دونوں بازوؤں پر زور دیکر ٹانگوں کو سیدھا کر کے اوپر اٹھائیں اور اس کے ساتھ ہی پورا جسم اوپر اٹھا دیں چند سیکنڈ اسی حالت میں رہئے اس طرح کئی مرتبہ کرنے سے آپ پیٹ کی بہت سی بیماریوں سے بچ سکتے ہیں۔

۴۔ پیٹ، گردن، پیٹھ اور ٹانگوں کے عضلات کو مضبوط بنانے کے لئے فرش پر چت لیٹ جائیں بازو پہلو میں سیدھے رکھیں اب دونوں ٹانگیں ملا کر انہیں آہستہ آہستہ بالکل سیدھا اوپر اٹھائیں اس کے بعد دونوں ہاتھ کمر پر رکھیں اور بازو کہنیاں زمین پر ٹیک کر پورا دھڑ اوپر کو اٹھا دیں صرف سر، پیٹھ کا کچھ حصہ، بازو اور کہنیاں زمین سے لگی رہیں۔ سینہ ٹھوڑی کو چھو رہا ہو اس حالت میں آپ اپنی دونوں ٹانگوں سے سائیکل چلانے کی کوشش کریں۔ یہ ورزش آپ کے دماغ اور خون کو تر و تازہ رکھے گی۔

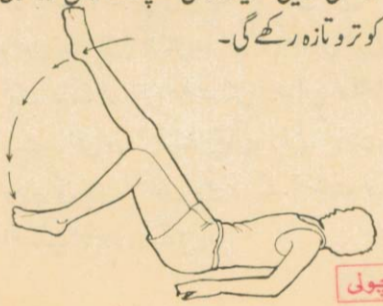

۵۔ کھڑے کھڑے ایک ہی جگہ دوڑیں، گھٹنوں کو اٹھا کر سینے کی طرف لانے کی کوشش کریں یہ ورزش آپ ٹانگوں کے عضلات کو مضبوط کرتی ہے۔

۶۔ زمیں پر گھٹنے ٹیک کر پنجوں کے بل بیٹھ جائیں اور آہستہ آہستہ پیچھے کی جانب جھکنا شروع کریں۔ ہاتھوں سے پاؤں پکڑ لیں۔ کمر بالکل کمان کی طرح جھک جائے اور اس حالت میں سینہ اوپر کو ابھرا رہے۔ اس ورزش سے چھاتی، دماغ، گردن، ریڑھ کی ہڈی، شانوں وغیرہ کے عضلات اور اعصاب مضبوط ہوتے ہیں۔

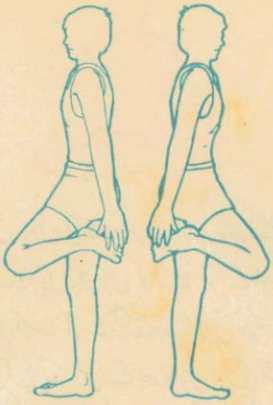

۷۔ اگر آپ کو گھٹنے یا پاؤں کا درد لاحق ہو تو سینہ تان کر سیدھے کھڑے ہو جایئے سر تا پاؤں سب ایک ہی سیدھ میں ہوں۔ اب بائیں ٹانگ کو آہستہ آہستہ اوپر کی جانب اٹھائیں اور بایاں ہاتھ پھیلا کر اس ٹانگ کا انگوٹھا پکڑنے کی کوشش کیجئے اس کے بعد دائیں ٹانگ اور دائیں ہاتھ سے ایسا ہی کیجئے۔

اگر دورانِ ورزش آپ کے جسم میں درد ہو رہا ہو یا آپ کا سانس پھول جائے تو پھر دوسری ورزش میں تھوڑا سا وقفہ دیں۔ بیک وقت جسم کے تمام اعضاء کی ورزش نہیں ہو سکتی۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ چند ورزشیں روزانہ باقاعدگی سے کی جائیں۔ انسانی جسم مشین سے بہت مختلف ہے کیونکہ مشین مسلسل استعمال سے گھستی رہتی ہے اس کے برعکس اگر ہم اپنے جسم کو محنت و مشقت کا عادی نہ بنائیں تو جسم کے عضلات اور پٹھے کمزور پڑ جاتے ہیں۔

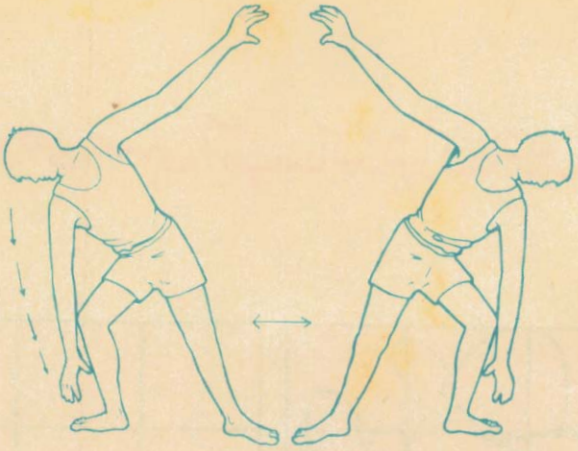

۸۔ مٹاپا ہمارے معاشرے میں ایک عام بیماری ہے اس بیماری میں مبتلا حضرات بعض اوقات حماقت میں اسے تندرستی اور صحت سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ مٹاپے سے سستی، کاہلی، دل کے امراض وغیرہ آپ پر اپنا گھیرا تنگ کر سکتے ہیں اس سے بچنے کے لئے آپ باقاعدگی سے ورزش کریں۔ ویسے تو موٹاپا دور کرنے کے لئے بہت سی ورزشیں ہیں آیئے ہم آپ کو ان میں سے ایک ورزش بتاتے ہیں بازوؤں کو کندھوں کے متوازی پھیلا لیں دونوں پاؤں پھیلا کر کھڑے ہو جائیں۔

اب آہستہ آہستہ دائیں طرف جھکیں اور دائیں ہاتھ سے دائیں پیر کی انگلیوں کو چھوئیں۔ اس ورزش میں آپ کو دائیں طرف جھکتے وقت اپنے دائیں گھٹنے کو ذرا جھکانا پڑے گا لیکن بائیں ٹانگ بالکل سیدھی رہے گا یہی سلسلہ بائیں جانب ورزش کرتے وقت بھی عمل میں رہے گا۔

ساتھیوں یہ تھیں وہ ورزشیں جو آپ آسانی سے کر سکتے ہیں لیکن مضمون ختم کرنے کے بعد اس کو صرف معلومات کی حد تک اپنے پاس محفوظ مت رکھئے بلکہ اس پر عمل بھی کیجئے گا۔ کچھ دنوں بعد آپ دیکھیں گے کہ آپ کے جسم میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوگئیں ہیں اور آپ پرکشش شخصیت کے مالک ہوتے جارہے ہیں۔ یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھ لیں۔

"درِحیرت" کھلتا ہے

آئندہ ماہ سے آنکھ مچولی میں سائنسی معلومات کا نیا سلسلہ **درِحیرت** شروع ہو رہا ہے آپ ہمارے "ماہرِ علومِ سائنس" سے سوال کیجئے آپ اپنے نام کے ساتھ اپنے ہر سوال کا تسلی بخش جواب پائیں گے۔

سب سے اچھے سوال پر آنکھ مچولی مُفت بھجوایا جائے گا

کیلا ھی سہی، آپ بنا کر تو رکھائیں!

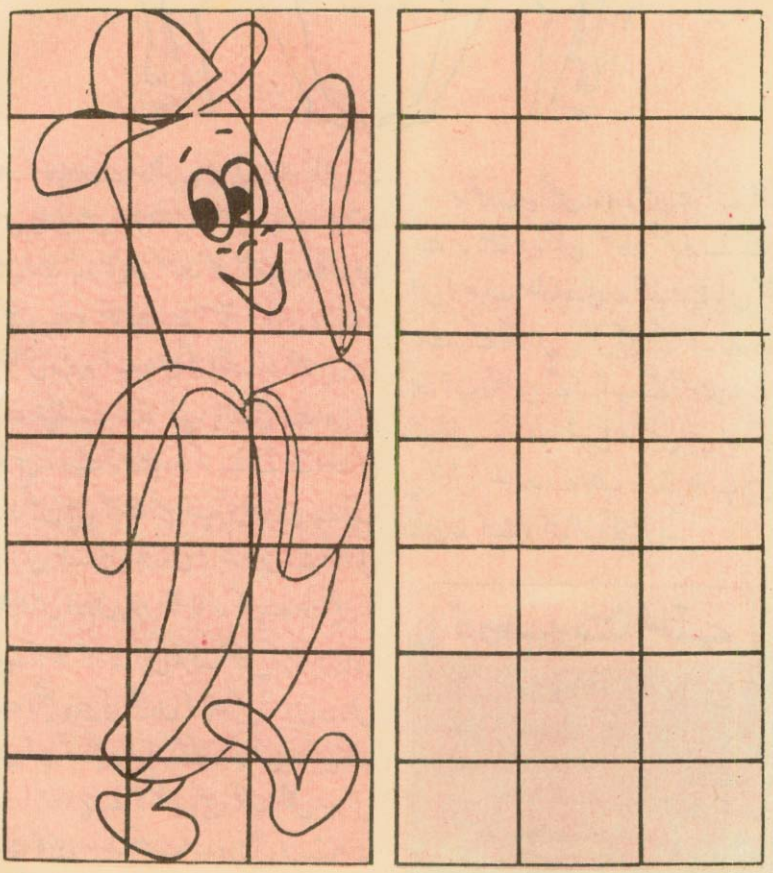

ہائے رے سردی

اخگر انوار اعوان

افریقہ کے کلا ہاری (Kalahari) پارک کی برفانی صبح میں اپنے آپ کو گرم رکھنا تمام پرندوں کا اجتماعی مسئلہ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں کے مگس خور (Bee Eaters) بھی اس مسئلے کو "مِل جل" کر ہی حل کرتے ہیں۔ ابابیل کی دم والے مگس خوروں کا یہ خاندان آدھے گھنٹے سے دھوپ سینکنے اور ایک دوسرے میں گھس کر حرارت حاصل کرنے میں مصروف تھا کہ فوٹو گرافر نے تقریباً ۲۰ فٹ دور سے یہ تصویر کھینچی۔ اگرچہ مگس خور بظاہر بے حس و حرکت دکھائی دیتے ہیں لیکن آخر والے دو تین مگس خور "گرمی" کی تلاش میں جھنڈ کے اندر تک گھسنے کی کوشش کرتے نظر آرہے ہیں۔

مل کر بیٹھنا اس پرندے کی جبلت (Instinct) میں شامل ہے۔ پرندوں کے ماہرین کا کہنا ہے کہ انہوں نے کبھی کسی مگس خور کو فرصت میں اکیلا بیٹھے نہیں دیکھا۔ بعض اوقات یہ ایک دوسرے پر چڑھ کر سوتے ہیں۔ جس سے رنگدار پروں کا ایک اہرام سا بن جاتا ہے۔ شہد کی مکھیاں اور بھِڑ ان کی خوراک ہیں۔ مگس خور فضا سے کسی شہد کی مکھی (یعنی مگس) یا بھِڑ کو چونچ میں دبوچ کر کسی درخت کی چوٹی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اب یہ اس کی پشت کو رگڑنا شروع کر دیتا ہے جس سے مگس یا بھِڑ کا زہر خارج ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور جب تمام زہر باہر نکل جاتا ہے یہ اسے آسانی سے نگل لیتا ہے۔

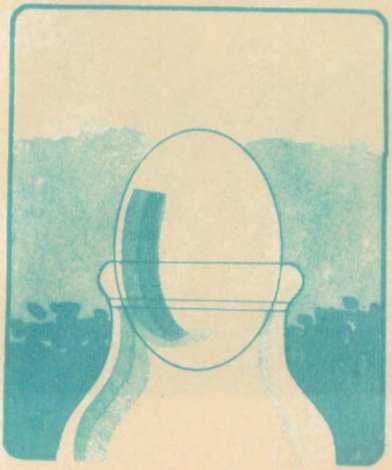

انڈے کا کھیل

کاشف طاہر

سعودی عرب

ساتھیو ! آج ہم آپ کو انڈے کا ایک مزیدار کھیل سکھائیں گے۔ اس کھیل کے لئے آپ کو ایک ابلا ہوا انڈا، انڈے کی چوڑائی سے نصف چوڑائی کا منہ رکھنے والی شیشے کی بوتل اور پھونک مارنے کے لئے ایک عدد منہ کی ضرورت ہوگی (جو یقیناً آپ کے پاس ہوگا۔)

ہاں ! تو سب سے پہلے یہ کیجئے کہ انڈے کو چھیلئے (خیال رہے کہ انڈا مکمل ابلا ہوا ہو ورنہ چھیلنے کی کوشش میں امی کی ڈانٹ کے سوا کچھ نہیں ملے گا) آپ نے انڈا چھیل لیا ۔ اب انڈے کو بوتل کے منہ پر رکھئے۔ انڈا کچھ دیر میں خود بخود بوتل کے اندر پھسل جائے گا۔ اب بوتل کے منہ کو اپنے منہ سے لگائیے۔ (جس طرح آپ پیپسی کی بوتل کے آخری قطرے کو پیتے ہیں۔) بوتل کے اندر زور سے پھونک ماریئے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ ابلا ہوا انڈا خود بخود آپ کے منہ میں واپس آ جائے گا اور آپ خوش ہو جائیں گے۔ یہی طریقہ آپ اپنے دوستوں کو حیران کرنے کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ انڈے کو بوتل میں ڈالنے کے بعد اپنے دوستوں سے کہئے کہ وہ کسی چیز سے چھوئے بغیر اور شیشی کو توڑے بغیر انڈے کو واپس باہر لائیں۔ وہ لاکھ کوشش کریں گے۔ بوتل کو ہلائیں گے، جُلائیں گے، اوپر نیچے کریں گے مگر انڈا باہر نہیں نکلے گا۔ تب آپ بتائے ہوئے طریقے کے مطابق انڈے کو آسانی سے باہر لا کر اپنے دوستوں کو حیران کر سکتے ہیں۔

سیّد نظر زیدی

قسط نمبر ۸

ظالم کا انجام

تینوں دوست محمد بن قاسم، موذ اور سعید آپس میں باتیں کرتے ہوئے بصرہ شہر سے باہر پہنچے۔ یہاں وہ اپنے ایک اور دوست کا انتظار کر۔نے لگے جو ان کے واسطے سواری کے گھوڑے لینے گیا ہوا تھا۔ موذ اور سعید آئندہ عید کو ہونے والے سالانہ فوجی کرتبوں اور ان میں حصہ لینے کے اپنے ارادوں کے بارے میں ہلکے پھلکے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ اس

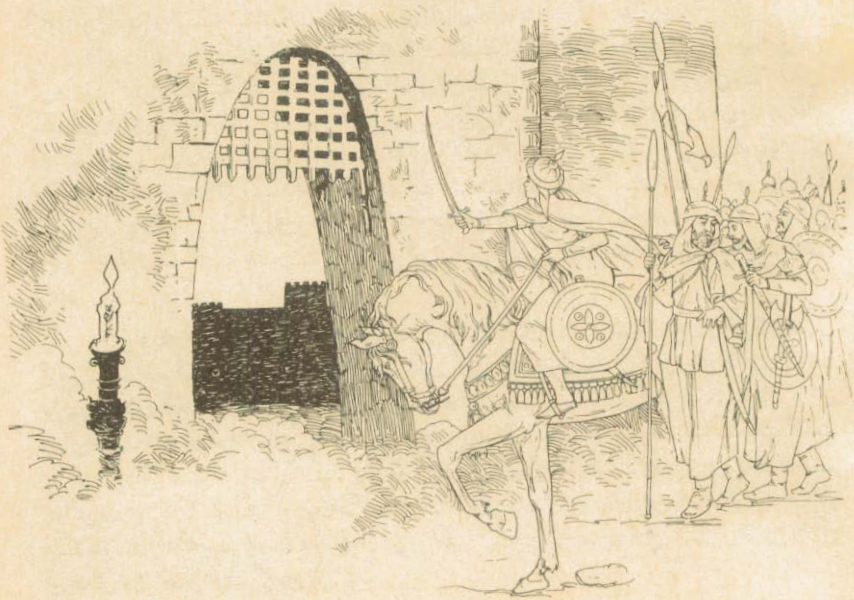

دوران ان کے گھوڑے پہنچ گئے اور وہ لوگ ان پر سوار ہو کر شہر سے ذرا دور دریا کنارے چلے گئے جہاں انہیں تیرنے، نیزہ بازی اور تلوار بازی کی مشق کرنی تھی۔ مشق کے بعد جب وہ واپس لوٹ رہے تھے تو ایک ڈاکو ان سے گھوڑے اور تلواریں چھیننے کی نیت سے وہاں آیا محمد بن قاسم سے مقابلے کے بعد شکست کھا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ ڈاکو دراصل اسلامی فوج کے ایک بہادر جرنیل بدیل تھے جو ان نوجوانوں کا امتحان لینے آئے تھے۔

عید کے دن دمشق کے باہر ایک کھلے میدان میں فوجی کھیلوں کے مقابلے کا انتظام کیا گیا تھا اور دن بھر مختلف کھیلوں کے مقابلے ہوتے رہے تھے۔ شام کو بالآخر ایک نوجوان تلوار بازی اور نیزہ بازی کے مقابلوں میں سب کو شکست دے کر میدان میں اکیلا رہ گیا۔ وہ چیلنج دینے کے انداز میں اپنا گھوڑا ادھر ادھر دوڑا رہا تھا۔ اس کے لباس سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ کس ملک کا باشندہ ہے۔ چہرے کو نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ آخر میں امیر المومنین کے چھوٹے بھائی سلیمان بن عبدالملک اس نوجوان کے مقابلے میں آئے مگر شکست کھا گئے۔ اب وہ نوجوان ایک انوکھی شان سے میدان میں تنہا کھڑا تھا۔ کوئی اس کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ سارا میدان اس کے لئے نعرہ ہائے تحسین سے گونج رہا تھا۔ امیر المومنین نے جب انعام دینے کے لئے اس کو اپنے قریب بلایا تو پتہ چلا کہ وہ محمد بن قاسم ہے۔ سب لوگ خوش ہوئے اور خاص طور پر امیر المومنین۔ محمد بن قاسم کی ذہانت علمی اور فوجی قابلیت کے پیش نظر امیر المومنین نے اس فارس کا والی مقرر کر دیا اور محمد بن قاسم اپنی والدہ سے مشورہ کرنے کی اجازت لے کر گھر چلا گیا۔

ان دنوں سندھ پر راجہ داہر کی حکومت تھی۔ یہ راجہ بہت ظالم اور بے ایمان شخص تھا۔ اس کی ایک برائی یہ تھی کہ اس نے اپنی سگی بہن سے شادی کر رکھی تھی۔ راجہ کے سارے درباری اس کے خوشامدی تھے۔ ایک دن بھرے دربار میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ لنکا سے آنے والے مسلمانوں کے دو تجارتی جہازوں کو لوٹ لیا جائے۔ ان جہازوں میں صرف عورتیں اور بچے تھے۔ ان کو لوٹنے کا کام سمندری ڈاکوؤں کے ذمے لگایا گیا۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے بلکہ ایک نوجوان مسلمان کی قیادت میں لڑتے ہوئے عورتوں اور بچوں نے ان ڈاکوؤں کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔

ابھی وہ لوگ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ ایک بار پھر کئی بڑے بڑے جہاز ان کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ یہ راجہ داہر کی فوج تھی۔ زید ہر قسم کی صورت سے نمٹنے کے لئے تیار تھا مگر سندھی فوج نے صلح کا جھنڈا لہرا کر دھوکا دیا اور چالاکی سے مسلمانوں کے دونوں جہازوں پر قبضہ کر کے عورتوں اور بچوں سمیت سب کو قیدی بنا لیا۔ راجہ داہر کے قید میں ان لوگوں پر بہت مظالم ڈھائے گئے۔ زید کو ان لوگوں نے دیوی پر قربان کرنے کا انتظام کر رکھا تھا مگر عین موقع پر چند نقاب پوش قربان گاہ پہنچے اور زید کو آزاد کر لیا گیا۔ یہ ہندوستان کے مظلوم، نیچی ذات کے لوگ تھے جو راجہ کے ظلم سے تنگ آکر اب آزادی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ زید نے انہیں یقین دلایا کہ اسلامی حکومت ضرور راجہ داہر کو سزا دے گی اور یہاں کے غریب اور ستم رسیدہ لوگوں کو اس کے ظلم سے نجات دلائے گی۔ نقاب پوشوں کے سردار نے زید کو بحفاظت ملک عرب تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔

عراق کا حکام حجاج بن یوسف اپنے دربار میں ایک سفیر کی زبانی ترکستان اور اندلس میں مسلمانوں کی جنگی کامیابیوں کی خبریں سننے کے بعد یہ فرمان جاری کرتا ہے کہ دونوں سپہ سالاروں کو سختی سے بتا دیا جائے کہ ان کا کوئی سپاہی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ غیر مذہب والوں کی کوئی عبادت گاہ تباہ نہ ہو۔ ان کے باغ اور کھیت برباد نہ کئے جائیں۔ اسی دوران سندھ سے فرار ہونے والا نوجوان زید دربار میں پہنچتا ہے اور اپنی داستان سناتا ہے حجاج بن یوسف غصے سے کانپ اٹھتا ہے اور سندھ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ابتداً دو مسلمان جرنیلوں کی شہادت کے بعد حجاج بن یوسف اور امیر المومنین ولید بن عبدالملک اور دیگر سردار یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ سندھ کی طرف بھیجی جانے والی فوج کا سالار محمد بن قاسم کو بنایا جائے حالانکہ امیر المومنین کے چھوٹے بھائی سلیمان بن عبدالملک اس تجویز کی مخالفت کرتے ہیں مگر پھر بھی محمد بن قاسم کی قیادت میں فوج سندھ کی طرف بھیج دی جاتی ہے۔

اسلامی فوجیں دیبل کے قلعے کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں۔ سندھ کے راجہ نے میدان میں نکل کر لڑنے کی بجائے قلعہ

بند ہو جانے کو ترجیح دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسلامی فوج کسی طرح بھی قلعے کی مضبوط دیواروں کو توڑ نہیں سکتی۔ اس لئے خود ہی تھک کر چلی جائے گی۔ محمد بن قاسم نے کئی دن تک انتظار کیا اس کے بعد وہ کسی نئی منصوبہ بندی کے لئے قلعے کا چاروں طرف سے جائزہ لینے کو نکلا تو ایک جگہ اس کی ملاقات ایک بوڑھے ہندو سے ہو گئی جس نے بتایا کہ اگر قلعے کے اوپر لگا ہوا جھنڈا گرا دیا جائے تو مسلمانوں کو فتح ہو سکتی ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ فتح کے بعد محمد بن قاسم نے ایک جلسہ عام میں اسلامی مساوات اور عدل کے عملی مظاہرے کے ساتھ پرجوش خطاب بھی کیا۔ ہندو عوام اپنے نئے آقاؤں سے بہت خوش تھے۔

دیبل کے ساحل کے قریب اغوا ہونے والی مسلمان عورتیں اور بچے راجہ داہر کی قید میں سخت مصیبتیں برداشت کر رہے تھے۔ لنکا کے رہنے والے ملاحوں کو تو ان لوگوں نے پہلے ہی قتل کر دیا تھا۔ راجہ داہر نے بھرے دریا میں قیدی مسلمان عورتوں اور بچوں کو اکٹھا کیا اور ان سے ایمان سے پھر جانے کا مطالبہ کیا۔ مگر سب نے کفر اختیار کرنے پر موت کو گلے لگانے کو ترجیح دی۔ راجہ ان کی ضد کے سامنے سرنگوں ہو گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ ان سب بچوں اور عورتوں کو عنقریب قید ہونے والی اسلامی فوج کے افسروں اور سپاہیوں کے سامنے قتل کیا جائے گا۔ اسلامی فوج دریائے سندھ کے اس پار حملے کی تیاری کے لئے منصوبہ بندی کر رہی تھی۔ آخر ایک رات محمد بن قاسم نے فوج کو تیاری کا حکم دیا اور سب سپاہی راہ میں حائل بہت سی مشکلات کو جاننے کے باوجود حملے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ **(اَب آپ آگے پڑھیئے)**

سندھ، برصغیر پاک و ہند کا سب سے بڑا دریا ہے۔ آج کل اس دریا سے بہت سی نہریں نکالی جا چکی ہیں پھر بھی میلوں میں پاٹ پھیلا ہوا ہے۔ پرانے زمانے میں تو اس کا پھیلاؤ بہت ہی زیادہ تھا اور پانی کا بہاؤ بھی بے حد تیز تھا۔ اس لئے راجہ داہر کو پوری بے فکری تھی کہ مسلمان دریا پار کر کے اس طرف نہیں آسکتے ..... اس نے دریا کے کنارے کنارے دور تک اپنی فوج کے سپاہی پھیلا دیئے تھے انہیں حکم دے دیا تھا کہ چڑیا کے بچے کو بھی اس طرف نہ آنے دینا اور خود اروڑ نامی شہر میں اطمینان سے بیٹھ رہا تھا ہاں مسلمانوں کو دھمکیاں ضرور دیتا تھا کہ میں دریا پار کر کے یہ کر دوں گا اور وہ کر دوں گا۔

خود اسلامی فوج کے سرداروں کا یہی خیال تھا کہ جب تک دریا کا پانی کم نہیں ہو جاتا اسے پار کرنا مشکل ہے۔ اور اگر کسی طرح سپاہی پار اتر بھی جائیں تو لڑائی کا بھاری سامان اور جانور کسی طرح دوسری طرف نہیں پہنچائے جاسکتے اور ان چیزوں کے بغیر لڑنا مشکل ہے، لیکن سپہ سالار محمد بن قاسم نے دریا پار کرنے کی ایک ایسی ترکیب نکالی کہ بغیر کسی قسم کے نقصان کے پوری اسلامی فوج اپنے سامان سمیت دریا پار پہنچ گئی۔

اس کم سن سپہ سالار نے ترکیب یہ نکالی کہ بہت سی کشتیاں اکٹھی کر کے انہیں دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ ایک دوسری سے جوڑ کے مضبوط رسوں سے بندھوا دیا، جب ان کشتیوں کی لین ڈوری کی لمبائی دریا کے پاٹ کے برابر ہو گئی تو اپنی فوج کے چنے ہوئے تیراندازوں کو ان کے اندر بٹھا دیا اور اس کے ایک سرے کو کنارے پر مضبوط باندھ کر دوسرے سرے کو پانی کے بہاؤ کی طرف دھکیل دیا۔ یہ سرا بہتا بہتا دوسرے کنارے پر پہنچا تو کشتیوں کا پل بن گیا اور کشتیوں میں بیٹھے ہوئے بہادر تیراندازوں نے

راجہ کے سپاہیوں پر تیر برسانے شروع کر دیئے اور انہیں دور ہٹا کر یہ سرا بھی دریا کے دوسرے کنارے پر مضبوط باندھ دیا۔ تاریخ میں ایسا پل پہلی بار بنایا گیا اور اس سے مسلمان دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ پل تیار ہونے کے بعد کون تھا جو عرب بہادروں کو روکتا، تیر اندازوں نے کشتیوں سے اتر کر مورچے تیار کر لئے اور مسلمان فوج نے نہایت آسانی کے ساتھ اپنے سامان اور جانوروں کو بھی دوسری طرف پہنچا دیا۔

جس وقت غازی محمد بن قاسم کی فوج دریا پار کر رہی تھی راجہ داہر اپنے محل میں سونے کے چپر کھٹ پر لیٹا میٹھی نیند کے مزے لے رہا تھا۔ اسے جگا کر یہ خبر سنائی گئی تو جگانے والوں پر بہت ناراض ہوا۔ لیکن صرف اپنے نوکروں چاکروں پر ناراض ہونے سے تو کام نہ چل سکتا تھا۔ نیند کی سستی کم ہوئی تو ساری بات سمجھ میں آئی اور لڑائی کے میدان میں جانے کی تیاری شروع کی۔

یہ شہر راجہ کا دارالحکومت تھا اور اس کی حفاظت کے لئے ایک بہت بڑی فوج ہر وقت کیل کانٹے سے لیس رہتی تھی۔ اس فوج کے علاوہ آس پاس کی ہندو حکومتوں کے سپاہیوں کی ایک اور بہت بڑی فوج راجہ کی مدد کے لئے پہنچ چکی تھی۔ جب یہ دونوں فوجیں میدان میں اکٹھی ہوئیں تو ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آنے لگے۔ سب سے آگے پہاڑ پہاڑ جتنے بڑے جنگی ہاتھی جھومتے جھامتے اور سونڈیں اٹھا اٹھا کر چنگھاڑتے چلے آرہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیدل فوج ہے۔ دائیں بائیں سواروں کے دستے اور بیچ میں خود راجہ کا ہاتھی۔

بھئی واہ! ان راجہ صاحب کا ٹھاٹ باٹ اور سج دھج تو دیکھنے کے قابل ہے، اگرچہ ایک زبردست فوج سے لڑنے کے لئے نکلے ہیں لیکن لباس اور ہاتھی کی سجاوٹ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ برات لے کر شادی کرنے جارہے ہیں۔ سونے کی عماری کے اندر ان کی دائیں بائیں دو خوب صورت لونڈیاں کھڑی ہیں، ایک کے ہاتھ میں عطر اور گلاب دان ہیں اور دوسری کے ہاتھ میں مورچھل، جس سے وہ مکھیاں اڑا رہی ہے۔

راجہ صاحب کو اس حال میں چھوڑ کر آیئے ذرا اسلامی فوج کا حال بھی دیکھیں۔ ارے یہ کیا! ادھر راجہ داہر کی فوج حملے کی تیاری کر رہی ہے اور ادھر یہ لوگ نماز کے لئے صفیں ٹھیک کر رہے ہیں، روزے کی وجہ سے ہر مجاہد کا چہرہ کسی قدر اترا ہوا نظر آرہا ہے، لیکن آنکھوں میں وہی چمک ہے۔ وہی عزم اور وہی حوصلہ ہے۔

اپنی فوج کو دو حصوں میں بانٹ کر محمد بن قاسم نے نماز ادا کی، جب تک ایک حصہ نماز ادا کرتا رہا دوسرا حصہ حفاظت کے لئے تیار کھڑا رہا اور جب سارے مجاہد نماز پڑھ چکے تو محمد بن قاسم ایک ایسی جگہ

آ کھڑے ہوئے جہاں سے ساری فوج پر ان کی نظر پڑ سکتی تھی۔ انہوں نے پہلے راجہ داہر کی ٹڈی دل فوج کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ان بہادر ساتھیوں کی طرف جو گنتی میں راجہ کی فوج کے چوتھائی بھی نہ تھے۔ لیکن یہ فرق دیکھ کر مایوس ہونے اور گھبرانے کی جگہ بہادر سپہ سالار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی انہوں نے اونچی آواز میں کہا،

"برادران اسلام!

اب وہ مقصد پورا ہونے کا وقت آگیا ہے جس کے لئے ہم اپنے وطن سے چل کر اس غیر ملک میں آئے ہیں، راجہ داہر کی فوج آپ کے سامنے ہے اور آپ میں سے ہر مجاہد یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کی گنتی بہت زیادہ ہے، اس کے ساتھ بہت سے لڑاکا ہاتھی بھی ہیں جن کی طاقت پر انہیں بہت زیادہ غرور ہے، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ لڑائیوں کا فیصلہ سپاہیوں کی گنتی زیادہ اور لڑائی کے سامان کے اچھا ہونے سے نہیں ہوا کرتا، بلکہ سچائی اور انصاف کی طاقت سے ہوتا ہے۔ بدر کے میدان میں ہمارے بزرگوں کی تعداد کل تین سو تیرہ تھی، ان کے پاس لڑائی کا سامان بھی پورا نہ تھا، لیکن ہزاروں کافروں کے مقابلے میں جیت انہی کی ہوئی۔ اس کے بعد احد اور خندق کے معرکوں کا بھی یہی نتیجہ نکلا۔ آج ہم بھی ایک نیک مقصد کے لئے تلوار اٹھا رہے ہیں۔ سندھ کا یہ راجہ ظلم اور بے انصافی میں حد سے بڑھ گیا ہے، نہ صرف یہ کہ اس نے ہماری بے گناہ بہنوں اور معصوم بچوں کو قید کر رکھا ہے، بلکہ خود اپنی قوم کے لوگوں پر ایسے ایسے ظلم کرتا ہے جن کا حال بیان نہیں ہو سکتا، ہم اس کے ظلم کا خاتمہ کرنے کے لئے آئے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ ضرور ہماری مدد کرے گا، لیکن میں آپ کو ایک بار پھر یاد دلاؤں گا کہ اللہ کی مدد صرف انہی لوگوں کو پہنچتی ہے جو واقعی انصاف اور سچائی پر ہوں۔ اس لئے ہمیں اپنے دلوں میں کھوٹ نہیں آنے دینا چاہئے۔ میں آپ میں سے ہر مجاہد کو تاکید کرتا ہوں کہ آپ کی تلوار صرف ان لوگوں کے خلاف اٹھے جو ہتھیار لے کر لڑنے کے لئے آئے ہیں۔ کسی بے گناہ امن پسند شہری کو ذرا بھی تکلیف نہیں پہنچنی چاہئے اور بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو تو کسی حالت میں بھی نہیں، یہ آپ کے مقدس مذہب اسلام کا آخری فیصلہ ہے۔"

اس مختصر سی تقریر کے بعد محمد بن قاسم نے اپنی فوج کے سرداروں کی طرف دیکھ کر کہا،

"عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ فوج کے سالار کی موت کے بعد سپاہی حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں، لیکن ہم مسلمانوں کا یہ چلن نہیں۔ یہ عہدوں کی بانٹ صرف انتظام رکھنے کے لئے ہوتی ہے ورنہ ہم میں سے ہر مجاہد سپہ سالار کے برابر ہے، اس لئے اگر میں شہید ہو جاؤں تو تم لوگ اس اونچے مقصد کو مت بھول جانا، حوصلہ مت ہار دینا، یہ لڑائی ہر قیمت پر فتح ہونی چاہئے۔ یاد رکھئے وہ بہنیں اور معصوم بچے نہایت بے چینی

سے آپ کے قدموں کی آہٹ پر کان لگائے ہوئے ہیں جنہیں راجہ داہر نے کسی اندھیری کوٹھڑی میں بند کر رکھا ہے، اس کے علاوہ اس ملک کے لاکھوں مظلوم باشندے بھی ایک نئی صبح کے انتظار میں ہیں اور یہ صبح صرف اسی صورت میں ہوگی جب آپ میں سے ہر مجاہد فتح حاصل کرنے کا پکا ارادہ کرے۔

میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے شہید ہونے کے بعد موز بن ثابت اس فوج کے سپہ سالار کا عہدہ سنبھالیں اور اگر وہ شہید ہو جائیں تو پھر سعید یہ جگہ لیں۔"

آخری فقرہ ختم کر کے اس کمسن مجاہد نے نیام سے تلوار گھسیٹ لی اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس کا رخ دشمن کی فوج کی طرف کر دیا۔ یہ حملے کا اشارہ تھا۔ روزہ دار مجاہد اپنے سالار کے پیچھے تیزی سے گھوڑے دوڑاتے دشمن کی طرف بڑھے۔

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

راجہ داہر اپنے سفید رنگ کے اونچے ہاتھی کی عماری میں اطمینان سے بیٹھا لڑائی کا تماشہ دیکھ رہا ہے، اس کی حفاظت کرنے والے خاص رسالے (باڈی گاڈ) نے اسے اپنے حلقے میں لے رکھا ہے، لیکن اسلامی فوج کے سپہ سالار محمد بن قاسم کا حال یہ ہے کہ وہ ایک عام سپاہی کی طرح نہایت بے جگری سے لڑ رہے ہیں

موز بن ثابت اور کئی اور مجاہد اپنے سپہ سالار کے ساتھ ہیں، انہوں نے شانے سے شانہ ملا کر ایک حلقہ سا بنا رکھا ہے اور اس طرح لڑتے ہوئے جس طرف نکل جاتے ہیں دشمن کی فوج میں ہلچل مچا دیتے ہیں۔ لڑتے لڑتے سعید نے ذرا کی ذرا ہاتھ روک کر موز کی طرف دیکھا اور اپنے ایک زخم سے خون پونچھتے ہوئے کہا،

سعید:۔ "بھئی موز! مجھے تو اس بات سے بہت رنج ہو رہا ہے کہ ہماری اور دشمن کی فوج کے تمام سپاہی لڑائی میں اپنا اپنا دل بہلا رہے ہیں لیکن ایک آدمی یونہی اداس بیٹھا ہے!"

موز:۔ (ہنستے ہوئے) "وہ بے چارہ کون ہے جس کے اوپر آپ کو اس وقت بھی ترس آ گیا؟"

سعید:۔ (راجہ کے ہاتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) "وہ دیکھو، وہ، سندھ کا راجہ۔ بے چارہ کیسا اداس بیٹھا ہے۔"

موز:۔ "پھر کیا ارادہ ہے جناب کا؟"

سعید:۔ "بھئی ارادہ تو نیک ہی ہے۔ آؤ ذرا آگے بڑھ کر اس کا دل بھی بہلائیں۔"

موز:۔ "واقعی نیک ارادہ ہے۔ آؤ کوشش کریں۔"

محمد بن قاسم:۔ (لڑتے لڑتے) "کیا نیک ارادہ ہے موز؟"

موز:۔ ”وہ دیکھئے سندھ کا راجہ الگ تھلگ کیسا اداس بیٹھا ہے، سعید کا خیال ہے ہمیں آگے بڑھ کر اس کا دل بہلانا چاہئے۔“

محمد بن قاسم:۔ ”میں بھی ابھی ابھی اس کے بارے میں سوچ رہا تھا، اور میرا خیال ہے شیخی بھگارنے اور کمزوروں کو ستانے کے سوا اس بے چارے کو تو کچھ آتا ہی نہیں، دیکھ رہے ہو اپنا ہاتھی کیسی شاندار جگہ ٹھہرایا ہے، بالکل جھیل کے کنارے کہ اپنی عادت کے مطابق بھاگنا بھی پڑے تو جھیل کے گہری تہہ کے سوا کوئی راستہ ہی نہ ملے۔“

سعید:۔ ”پھر تو ہمارا کام اور بھی آسان ہے، میرا خیال ہے میں اکیلا ہی اس بے چارے کو زندگی کی مصیبت سے چھٹکارہ دلاتا ہوں۔“

محمد بن قاسم:۔ ”نہیں سعید! ابھی ایسا وقت نہیں آیا کہ تم اپنے آپ کو اتنے بڑے خطرے میں ڈالو۔ انشاءاللہ ہم ان سب کو بہت جلد بھگا دیں گے۔“

اتنا کہہ کر محمد بن قاسم دوسری طرف متوجہ ہوگئے۔ ہاتھیوں کی ایک ٹکڑی نے اسلامی فوج کے بائیں بازو پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ وہ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس جگہ پہنچے اور حملہ کرنے والے ہاتھیوں کو بھگانے کے بعد پھر جو لڑائی کے میدان کی طرف نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ راجہ کا ہاتھی اپنی جگہ نہ تھا۔ بلکہ پوری تیزی کے ساتھ جھیل کی طرف بھاگا جا رہا تھا، مہاوت اسے روکنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا لیکن وہ کسی طرح رکنے میں نہ آتا تھا کیونکہ اس کی سونے کے بڑھیا کام والی لمبی جھول دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔

اتنی دیر میں پھر لڑائی کا زور بڑھ گیا، اب کی عرب مجاہدوں نے راجپوت سواروں کے اس رسالے پر زور دار حملہ کر دیا تھا جو اب تک اپنی جگہ جما ہوا نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا اور پوری سندھی فوج کے داہنے پہلو کو سنبھالے ہوئے تھا۔

یہ حملہ خود محمد بن قاسم کی ہدایت کے مطابق ہوا تھا، اس لئے وہ ہاتھی کی طرف سے دھیان ہٹا کر اس طرف متوجہ ہوگئے۔

”ہر ہر مہادیو“ اور ”اللہ اکبر“ کے نعرے میدان میں گونجنے لگے۔ بہادروں کی تلواریں پورے زور سے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگیں اور خود سپہ سالار کے نزدیک وہ وقت آگیا جب دو چار گھنٹے کے بعد اس لڑائی کا فیصلہ ہو جانا چاہئے تھا، لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے اندازے سے بہت پہلے ہی سندھی فوج میدان سے بھاگنے لگی۔ اور تو اور اس راجپوت رسالے نے بھی جی ہار دیا جس کے سپاہی ابھی بہت دیر تک لڑ سکتے تھے اور جن کے بارے میں محمد بن قاسم کا یہ خیال تھا کہ لڑائی کا فیصلہ ہونے کے

بعد بھی ہمیں ان سپاہیوں کو ہرانے کے لئے بہت زیادہ کوشش کرنی پڑے گی۔

سپہ سالار نے اپنا گھوڑا روک کر ایک بار پھر لڑائی کے پورے میدان پر نظر ڈالی۔ راجہ کا ہاتھی جھیل سے نکل کر اپنے ہی سپاہیوں کو کچلتا ہوا پوری طاقت سے ایک طرف بھاگا جا رہا تھا اور اس کی پیٹھ پر نہ راجہ تھا نہ مہاوت۔ یہ دیکھ کر وہ سندھ کی فوج کے یوں دیکھا دیکھی بھاگ کھڑے ہونے کی وجہ سمجھ گئے۔ تلوار نیام میں ڈال کر گھوڑے کی پشت پر ہی شکرانے کا سجدہ ادا کیا، اور پھر پوری طاقت سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا، ان کی آواز کے ساتھ تمام مسلمانوں کی آوازیں گونج اٹھیں۔ یہ نعرہ فتح کا نعرہ تھا۔ جسے سن کر راجہ کی فوج کے ہر سپاہی کا دل کانپ گیا۔ تھوڑی دیر بعد عرب مجاہد ایک دوسرے کو فتح کی مبارک باد دے رہے تھے اور لڑائی کا میدان سندھی سپاہیوں سے بالکل خالی ہو چکا تھا۔ (باقی آئندہ)

حسن انتخاب

مرسلہ: مہرین فاطمہ گوہر

سکھوں کے مشہور مہاراجہ رنجیت سنگھ بچپن ہی سے ایک آنکھ سے "کانے" تھے۔ ایک دن مہاراجہ نے شاہی مصور کو ان کی حسین و جمیل تصویر بنانے کے لئے کہا۔ ساتھ ہی کہا کہ اگر تصویر پسند نہ آئی تو مصور کو قتل کر دیا جائے گا۔

مصور نے ہر زوایئے سے تصویر بنا کر دیکھی لیکن کانے پن کی وجہ سے تصویر خوبصورت نہ بن سکی۔ آخر مصور نے ایک آخری تصویر مہاراجہ کو پیش کی جو رنجیت سنگھ کو اتنی پسند آئی کہ اس نے مصور کو مالا مال کر دیا۔

دراصل تصویر کچھ یوں تھی کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ تیر کمان سے ایک آنکھ بند کر کے ہرن کا نشانہ لے رہے ہیں اس طرح آنکھ بند کر کے مہاراجہ کی کانی آنکھ کا نقص بھی چھپ گیا اور مصور کی ذہانت نے اس کی جان بچالی اور وہ انعام و اکرام سے بھی نوازا گیا۔

کینیڈا سے نیرّہ بخت ناز کا تحفہ

چاند اور تتلیاں

قلعہ کی چھت پر ایک بہت بڑی دوربین لگی ہوئی تھی۔ جس کا رخ چاند کی طرف تھا اور اس پر ایک بوڑھا شخص جھکا ہوا تھا۔ اس کا نام عبدالرحیم تھا۔ وہ اس دوربین سے کچھ دیکھ رہا تھا۔ رات کا وقت تھا اور پورا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ وہ کافی دیر سے دوربین سے کچھ تلاش کر رہا تھا کہ اچانک ملک کے وزیر اعظم کی بلند اور جوشیلی آواز میں کچھ جملے اس کے کان سے ٹکرائے تو وہ چونکا۔ اسے معلوم ہوا کہ وزیر اعظم اسی سے مخاطب تھے۔ "اے عبدالرحیم! کیا تم میرے لئے چاند پر تتلیاں ڈھونڈو گے؟" اور اس پر عبدالرحیم نے مودبانہ عرض کیا کہ جناب عالی چاند پر تتلیاں کہاں؟ چاند کی آب و ہوا ٹھنڈی اور خشک ہے۔ وہاں ہوا نہیں ہوتی اور وہاں کوئی نہیں رہ سکتا۔"

وزیر اعظم! (چلا کر)..... "خاموش کیا میں تمہیں ہر مہینے اتنی تنخواہ نہیں دیتا کہ تم اپنی بیوی بچوں

کے ساتھ آسانی سے گزارہ کر سکو۔"

عبدالرحیم..... "بے شک۔"

بوڑھا عبدالرحیم ایک غریب ماہر فلکیات تھا وزیر اعظم ناراض ہو جاتے تو اس پر مصیبت اور پریشانی کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے اس لئے بے چارہ خاموش رہا۔

وزیر اعظم عبدالرحیم کو خوف زدہ دیکھ کر خوش ہوئے اور گرج کر حکم دیا کہ اگر وہ ان کی یہ فرمائش پوری نہ کر سکا تو وزیر اعظم اس کی گردن کاٹ دیں گے۔ بوڑھا ماہر فلکیات سر جھکائے کھڑا کانپتا رہا۔

اچانک وزیر اعظم کو کچھ یاد آیا اور انہوں نے عبدالرحیم کو مزید پریشان کرنے کے لئے دریافت فرمایا!

وزیر اعظم: "عبدالرحیم کیا تم کبھی چاند پر گئے ہو۔"

عبدالرحیم: "نہیں جناب!"

وزیر اعظم: "پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ چاند پر تتلیاں نہیں ہیں۔ ایک ماہ بعد میرے خاص مہمان آئیں گے۔ میں ان کو چاند پر تتلیاں دکھانا چاہتا ہوں۔ تمہارے پاس ایک ماہ کا وقت ہے۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہمارے حکم کی تعمیل ہونی چاہئے اور بس۔"

وزیر اعظم اتنا کہہ کر اپنی بگھی میں بیٹھ کے محل چلے گئے۔ ادھر عبدالرحیم پریشان اور گھبرایا ہوا گھر پہنچا اور اپنی عقل مند بیٹی عینی کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اس کے بعد عینی اس مسئلے کو حل کرنے کی فکر میں ڈوب گئی۔

ایک دن عینی اپنے والد کی دوربین صاف کر رہی تھی کہ وزیر اعظم ادھر آنکلے عینی کو دیکھ کر انہوں نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

وزیر اعظم: لڑکی تم جانتی ہو میرے مہمان چاند پر تتلیاں دیکھنا چاہتے ہیں اور میں نے یہ ذمہ داری تمہارے ابا کے سپرد کی ہے؟

عینی: "لیکن وزیر اعظم صاحب! چاند پر تتلیاں نہیں ہوتیں۔"

وزیر اعظم: "اے لڑکی خاموش ہو جاؤ۔ تمہیں کسی سے بات کرنے کا طریقہ بھی نہیں آتا۔"

(وزیر اعظم کی آواز سن کر بوڑھا ماہر فلکیات عبدالرحیم بھی وہاں آگیا تو وزیر اعظم نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔)

"عبدالرحیم سنو تتلیاں صرف دوربین سے ہی نہیں دیکھی جاسکتیں۔ بلکہ جب رات کو موسیقی کی مدھم آواز گونجتی ہے تو ساری رنگ برنگی تتلیاں چاند سے زمین پر اتر آتی ہیں۔"

وزیر اعظم صاحب تو یہ کہہ کر رخصت ہوگئے لیکن دونوں باپ بیٹی کو سخت پریشانی میں چھوڑ گئے۔

عبدالرحیم نے اس رات خدا کی عبادت کی اور عینی نے بھی فکر مندی میں گزاری۔ آخر رات گئے عینی کی سمجھ میں ایک بات آہی گئی۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ وہ پورے تین ہفتے مسلسل اپنا کام کرتی رہی۔ پھر وہ رات آگئی جس دن وزیر اعظم کے مہمان خاص تجربہ گاہ میں تشریف لائے۔ عوام کا ایک ہجوم قلعے کے نیچے باغ میں چاند پر تتلیوں کا تماشا دیکھنے کو بے تاب تھا۔ عوام جانتے تھے کہ بوڑھا ماہر فلکیات تتلیاں ڈھونڈ کر نہ لاسکا تو اس کو سزا ہو جائے گی۔ عبدالرحیم کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اور ہاتھوں کے طوطے اڑ رہے تھے۔ اس نے وزیر اعظم کو دوربین سے چاند کی طرف دیکھنے کی دعوت دی۔ چاند پورا نکلا ہوا تھا۔ وزیر اعظم اپنی کرسی سے اٹھے اور مہمان کو فخریہ انداز میں دوربین سے دیکھنے کی دعوت دی۔ مہمان خصوصی اٹھے اور دوربین سے آنکھیں لگالیں۔ "اف میرے خدا! چاند پر تو تتلیاں ہی تتلیاں ہیں۔" وہ خوشی سے چلائے اور ماہر فلکیات کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بھلا چاند پر تتلیاں کہاں سے آئیں۔ پھر باری باری مہمان اور معزز شہریوں نے دوربین سے جھانکا اور تعریفی نعرے بلند ہونے لگے۔

عبدالرحیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کہ یہ سب کیا ہے وہ اسے بھیانک مذاق سمجھ کر دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگنے لگا۔ نامعلوم اب کیا ہونے والا ہے۔ وزیر اعظم نے عینی کو بھی اجازت دی کہ وہ دوربین سے چاند کو ضرور دیکھے۔ عینی نے دوربین کے قریب پہنچ کر ہوشیاری سے ایک ایسا بٹن دبا دیا کہ دوربین کا بڑا شیشہ ٹوٹ گیا اور تتلیاں ہوا میں اڑنے لگیں۔ اس پر وزیر اعظم چونک پڑے اور کچھ بڑبڑانے لگے لیکن ان کی آواز ہجوم کے شور میں دب گئی۔ ہجوم چلا رہا تھا۔ "دیکھو تتلیاں واپس چاند پر جارہی ہیں۔ تیز ہوا انہیں اوپر ہی اوپر لے جارہی ہے۔"

اچھے بچو! کیا تم جانتے ہو کہ یہ تتلیاں کہاں سے آئیں۔ اصل میں عینی نے خود بنائی تھیں اور وہ سب کی سب کاغذ کی تھیں۔

وقت مولانا رومیؒ کی نظر میں۔ انتخاب ۔ سحر ناز، لاہور

وقت ہمارے پاس اس طرح آتا ہے جیسے کوئی دوست بھیس بدل کر اور تحفے لے کر آتا ہے اگر ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو وہ چپ چاپ اپنے تحفوں کے ساتھ واپس چلا جاتا ہے۔

ذہن کے حیرت انگیز کمالات

محمد بن مالک محمدی

انسانی دماغ جو کہ کروڑوں، اربوں پیچیدہ خلیوں کا انتہائی پیچیدہ مرکب ہے، قدرت کے سربستہ رازوں میں سے ایک ہے۔ جسم انسانی میں سب سے حیرت انگیز اور کرشمہ کار عضو دماغ ہی ہے۔ ماہرین دماغ کے بارے میں اب تک جو کچھ جان چکے ہیں وہ آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ انسانی دماغ میں جتنی صلاحیت ہوتی ہے ایک عام انسان اس میں سے صرف دس سے پندرہ فیصد تک کی صلاحیت کو بروئے کار لاتا ہے۔

"ہمارا دماغ ہمارے جسم کا ایسا حصہ ہے جسے ہم نہیں جانتے کہ اسے کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ انسان کو شاید مزید ہزاروں سال یہ جاننے میں لگ جائیں کہ دماغ کو کیسے صحیح طرح استعمال کرنا ہے۔ یا شاید یہ عرصہ بھی کم ہو۔"

(مشہور برطانوی نفسانی محقق Arthur Ko-estkos کے الفاظ)

ہمارا جسم دماغ کے اشاروں کا غلام ہوتا ہے۔ دماغ اپنے ماحول سے جو تاثر قبول کرتا ہے اس کا اثر سارے جسم پر پڑتا ہے۔ مثلاً اگر آپ بہت ہی

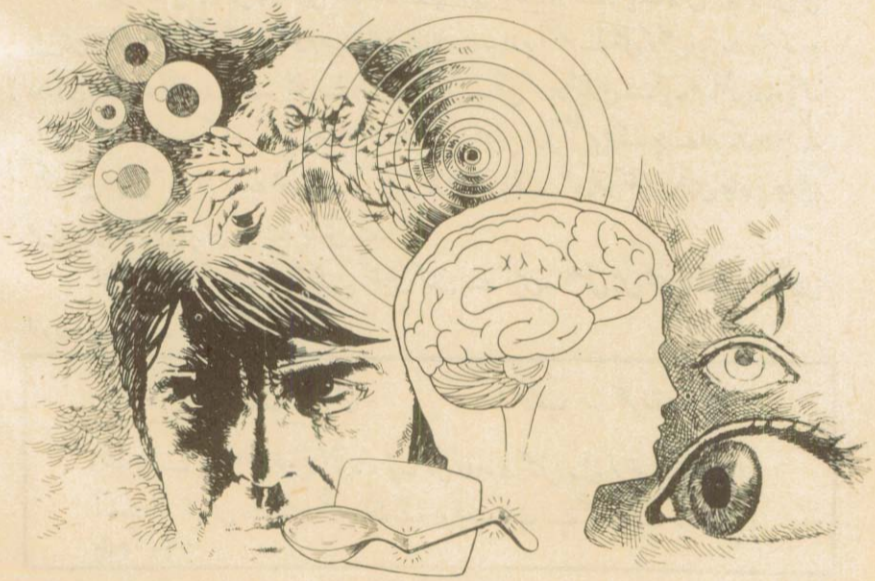

ڈرپوک قسم کے آدمی ہیں اور آپ کے علم میں کوئی بہت خوفناک قسم کی بات آئے تو آپ مارے ڈر کے کانپنے لگتے ہیں۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، اعصاب کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ دماغ دراصل جسم و جان کا لیڈر، کنٹرولر یا شہنشاہ ہوتا ہے۔ اور یہ جسم کو جو کچھ سمجھاتا ہے، جسم وہی قبول کرتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کھیل رہے ہیں کھیل کھیل میں آپ کے چوٹ لگ گئی۔ جسم نے اعصابی رگوں اور ریشوں کے ذریعے دماغ کو چوٹ لگنے کا پیغام پہنچایا، تاکہ آپ کو تکلیف کا احساس ہو اور آپ چوٹ کی طرف متوجہ ہوں لیکن چونکہ دماغ کی توجہ پوری طرح سے کھیل کی جانب مرکوز تھی اس لئے اس نے کوئی خاص تاثر نہیں لیا، تھوڑی دیر چوٹ کے بارے میں سوچنے کے بعد دوبارہ کھیل میں مشغول ہو گیا۔ اس طرح آپ کے جسم کو تکلیف کا احساس نہیں ہوا یا بہت کم ہوا۔

انسانی دماغ یا ذہن کی چند حیرت انگیز اور پر اسرار قوتیں ذیل میں درج ہیں۔ جو ہر انسان میں تھوڑی بہت ضرور ہوتی ہیں اور جنہیں مختلف طریقوں سے اجاگر کیا جاسکتا ہے۔

ٹیلی پیتھی (Tely Pathy)

خیالات کا ایک دماغ سے دوسرے دماغ کی جانب بغیر کسی ذریعہ کے بہنا یا رواں ہونا۔ جو زمان و مکان (وقت اور فاصلے) کی قید سے آزاد ہو۔

کلیئر وائنس (Clairnoyance)

دور کی چیزوں کو بغیر کسی ذریعے کے دیکھ لینا۔

پری کاگنیشن (Precognition)

مستقبل کے بارے میں جاننا۔

سائیکوکنیسس (Psychokinesis)

صرف تصور کے زور پر کسی ذریعے کے بغیر چیزوں کو متحرک کر دینا یا ان کو توڑ موڑ دینا۔

فی الحال ہم یہاں صرف سائیکوکنیسس کا تفصیل سے ذکر کریں گے۔

سائیکوکنیسس

سائیکوکنیسس دراصل ہماری قوت متخیلہ یا تصور کی قوت کا نام ہے۔ سائیکوکنیسس کو مختصر طور پر پی کے (P-K) کی قوت کہا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل ٹیلیویژن پر ایک انگریزی فلم "میتھیو اسٹار" آیا کرتی تھی۔ جس میں اس فلم کا ہیرو میتھیو محض اپنی پی۔ کے کی قوت کے بل پر آنکھوں کے ذریعے گھورتے ہوئے کوئی بھی چیز ہوا میں معلق کر دیتا تھا۔ مختلف چیزوں کو متحرک کر دیتا تھا یا ان کو توڑ موڑ دیتا تھا۔ یہ تو خیر فلمی دنیا کی بات ہے۔ لیکن حقیقت میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو مذکورہ قوتوں کے حوالے

سے اپنی مثال آپ ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں برطانوی نوجوان یوری گیلر (Urigeller) کا نام سرفہرست آتا ہے۔

یوری گیلر محض اپنے تخیل کی قوت سے چیزوں کو چھوئے بغیر توڑ موڑ دیتا ہے۔ یا انہیں ہوا میں معلق کر دیتا ہے۔ ماہرین کے تجزیہ کے مطابق گیلر کی پی۔ کے (P-K) کی قوت بہت زیادہ طاقتور ہے۔ ایک مرتبہ یوری گیلر نے ایک ٹی وی پروگرام میں لاکھوں ناظرین کے سامنے ایک چمچے کو موڑ کر دوہرا کر دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ناظرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہ اپنے اپنے ٹی وی سیٹ کے آگے چمچے وغیرہ رکھ دیں۔ (یہ پروگرام براہ راست نشر ہو رہا تھا) اس وقت تمام ناظرین حیرت سے انگشت بدنداں رہ گئے جب یوری گیلر نے ان تمام چمچوں کو بھی موڑ کر رکھ دیا۔

آپ بھی اپنے اندر اس قوت کو ابھار سکتے ہیں۔ لیکن اس قوت کو پانے کے لئے مندرجہ ذیل چیزیں ہونا بہت ضروری ہیں۔

۱..... قوت ارادی (Will Power) مضبوط اور مصمم ارادے کا نام قوت ارادی ہے۔

۲..... اعتماد یا یقین کی قوت (Co-nfidence) اپنے اندر یہ اعتماد پیدا کرنا کہ فلاں کام میں لازمی طور پر کروں گا۔

۳..... قوت ہدایت (Suggest-ion) کام کے دوران بار بار اپنے آپ کو یہ سمجھانا کہ میرا یہ کام مکمل ہو رہا ہے۔

۴..... ارتکاز توجہ (Concent-ration) جو کام آپ کر رہے ہوں اس کی طرف پوری یکسوئی اور مکمل توجہ ہونی چاہئے۔

مندرجہ ذیل طریقے سے آپ نہ صرف اپنی پی۔ کے ٹیسٹ کر سکتے ہیں بلکہ اس تجربے کو بار بار دہرا کر اپنی قوت میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔

ایک دھاگہ لیکر کسی ایسی جگہ باندھ دیں جہاں دھاگہ ہوا میں معلق رہتے ہوئے نظروں کے بالکل سامنے ہو۔ اور اگر اسے چاروں طرف سے حرکت دی جائے تو وہ کسی چیز سے ٹکرائے بھی نہیں۔ یہ خیال رہے کہ کمرے میں ہوا بالکل ساکت ہو تاکہ دھاگہ ہلنے نہ پائے۔ اب آرام سے بیٹھ کر دھاگے کو گھورنا شروع کریں اور ذہن میں یہ تصور کریں کہ دھاگہ ہل رہا ہے..... دائیں بائیں۔ بار بار اس خیال کو ذہن میں دہراتے رہیں اور دھاگے کے ہلنے کا عکس ذہن میں لائیں۔ آپ کا تصور جتنا واضح اور طاقتور ہو گا اتنی ہی کامیابی ہوگی۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ دھاگہ دائیں اور بائیں حرکت کر رہا ہے۔ اب آپ اسے آگے پیچھے حرکت کرنے کا حکم دیں۔ اس خیال کو بھی بار بار ذہن میں دہراتے رہیں۔ حتیٰ کہ دھاگہ آگے پیچھے حرکت کرنے لگے..... اس

طرح آپ اپنا پی۔ کے (P-K) ٹیسٹ کر سکتے ہیں۔

یہ تجربہ روزانہ کریں۔ جب آپ کو اس میں مکمل مہارت ہو جائے تو پھر دھاگے کے نچلے سرے پر کوئی چھوٹی اور ہلکی سی چیز (مثلاً پیپر کلپ وغیرہ) باندھ کر اسے بالکل ساکت کر دیں۔ اب اس دھاگے کو ہلنے کا حکم دیکر اس کی حرکت کا مشاہدہ کریں۔ یہ تجربہ بھی روزانہ کریں۔ یہاں تک کہ دھاگہ آپ کے حکم پر فوراً متحرک ہونا شروع کر دے۔ اسی طرح دھاگے کے نچلے سرے کے وزن میں بھی اضافہ کرتے رہیں۔ آپ کے حکم کا چیزوں پر جتنی جلدی اثر ہو گا، آپ کی پی کے (P-K) کی قوت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

اگر کسی وجہ سے آپ مندرجہ بالا طریقہ اختیار نہ کر سکیں تو ایک اور بہت سادہ اور آسان سا طریقہ ہے۔ دیوار پر انگلی کی مدد سے پانی کا ایک قطرہ ڈال دیں۔ وہ لڑھکتا ہوا نیچے آئے گا اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ساکت ہو جائے گا۔ اگر قطرہ کافی دیر تک ساکت رہے تو اپنا تجربہ شروع کریں۔ قطرے کو نیچے آنے کا حکم دیں۔ آہستہ آہستہ قطرے میں حرکت پیدا ہوتی جائے گی۔ اور وہ نیچے دوبارہ لڑھکنا شروع کر دے گا، یہاں تک کہ زمین سے جا لگے گا۔

ایک ضروری بات ..... یہ تجربات ہمیشہ چھٹیوں میں اور فارغ اوقات میں کیا کریں۔ ورنہ اس سے آپ کی پڑھائی متاثر بھی ہو سکتی ہے۔

"سب سے بڑا انسان"

زیر طبع

ادارہ آنکھ مچولی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی صدارتی ایوارڈ یافتہ کتاب "سب سے بڑا انسان" کا نیا ایڈیشن زیر طبع ہے۔ نئے آرڈر کی تکمیل میں کچھ عرصہ لگے گا۔ جو لوگ اس کتاب کے لئے اپنا آرڈر یا رقم بھجوا چکے ہیں ان کے لئے اطلاعاً عرض ہے ——— (ادارہ)

نوٹس بورڈ

اگر آپ آنکھ مچولی میں لکھتے ہیں یا لکھنا چاہتے ہیں تو درج ذیل باتیں ضرور پڑھ لیجئے۔

آنکھ مچولی میں تمام تحریریں اپنے معیار کے مطابق نمبر آنے پر شائع ہوتی ہیں۔

آنکھ مچولی میں (سوائے "قلم قبیلے" کے) تمام شائع ہونے والی تخلیقات کا معاوضہ دیا جاتا ہے

نقل شدہ تحریروں، انتخاب، اقوال وغیرہ کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا۔

آپ تحریریں بھجوانے سے قبل یہ اطمینان ضرور کرلیں کہ آپ کی ہر تحریر کے پیچھے آپ کا نام اور پتہ صاف صاف لکھا ہوا ہے۔

ایک کاغذ پر دو مختلف نوعیت کی تحریریں قابلِ قبول نہ ہوں گی۔

اپنی تحریروں کے بارے میں یا کچھ اور جاننے کے لئے جوابی لفافہ ضرور بھجوائیں۔

اپنی ہر تحریر کے ساتھ "ذاتی کوائف، قلم کار" کا کوپن ضرور منسلک کریں جو اس شمارے کے آخری صفحات میں موجود ہے۔

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آپ اگر واقعی کمسن ہیں تو مختصر تحریروں کا یہ سلسلہ آپ ہی کیلیئے ہے۔ یاد رہے کہ صاف، خوشخط اور مختصر ترین تحریریں جلد شائع ہو سکیں گی۔ جس تحریر کی پشت پر قلمکار کا نام پتہ درج نہ ہوگا اسے مایوسی ہوگی۔ نقل شدہ تحریروں کی سزا "بلیک بکس" برقرار رہے گا۔ کمسن قلمکار چاہیں تو اپنی تحریروں کے ساتھ اپنی تصاویر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ تصویر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ قلمکار ساتھی آنکھ مچولی میں شائع ہونے والا نوٹس بورڈ وقتاً فوقتاً ضرور پڑھتے رہا کریں۔ کمسن قلمکار میں شائع ہونے والی تحریروں کو آنکھ مچولی کی اعزازی کاپی روانہ کی جائے گی۔

(ادارہ)

رحمت کا طالب

محمد نواز اعوان، فیصل آباد

تیری رحمت کا طلب گار ہزں میں
دے شفا مجھ کو کہ بیمار ہوں میں
جب تیری نظر کرم ہے مجھ پر
کیوں بھری دنیا سے بے زار ہوں میں؟
میں تو اس کو بھی عبادت تری گردانتا ہوں
تیرے بندوں کا وفادار ہوں میں
تیرے احسانوں کا ہو شکر ادا کیسے بتا
ناتواں اور گنہگار ہوں میں

دجل

مرسلہ: سید حیدر علی کراچی

ڈاکٹر طارق آج دیر سے اپنے پرائیوٹ ہسپتال پہنچے تھے انھوں نے دیکھا کہ ان کا

اسسٹنٹ ایک عورت سے کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ عورت کہہ رہی تھی۔ "دیکھئے بھائی صاحب آپ میرے شوہر کو ہسپتال میں داخل کر دیں میں فیس آپ کو بعد میں دے دوں گی۔" "معاف کیجئے گا خاتون ہمارے بھی کچھ اصول ہیں جن میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص ہمارے ہسپتال سے علاج کروا رہا ہے تو اسے پیشگی فیس ادا کرنی پڑے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آپریشن ناکام ہو جائے تو بعض لوگ پیسے نہیں دیتے اور بہانہ یہ بناتے ہیں کہ ہمیں تو آپ کے اس اصول کا پتہ نہیں تھا کہ آپریشن چاہے کامیاب ہو یا ناکام آپ کو فیس ادا کرنی ہوگی۔" اسسٹنٹ نے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر طارق نے عورت کے قریب آکر کہا۔ "بہن جی آپ کے شوہر کا مرض کیا ہے؟" اسسٹنٹ نے کہا "سر ان کے شوہر ہیروئن کے عادی ہیں۔"

ڈاکٹر طارق نے عورت سے کہا "بہن جی آپ ان کو فوراً لے آیئے انشاء اللہ ان کا علاج میں خود کروں گا آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر طارق ہسپتال میں داخل ہوگئے۔ ان کا اسسٹنٹ بھی ان کے ساتھ تھا۔ جب وہ اپنے بیٹھنے کے کمرے میں داخل ہوئے تو اسسٹنٹ نے ڈاکٹر طارق سے کہا۔ "سر آپ نے خواہ مخواہ اس عورت کو کہہ دیا کہ تمہارے شوہر کا علاج ہوگا جا کر اسے لے آؤ حالانکہ یہ بات آپ بھی جانتے ہیں کہ اس عورت کے پاس فیس ادا کرنے کے لئے ایک پائی بھی نہیں ہے۔ "دولت ہی تو ہر چیز نہیں۔" ڈاکٹر طارق نے کہا۔ "تو کیا آپ اس کے شوہر کا مفت علاج کریں گے۔" اسسٹنٹ ڈاکٹر نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ "ہاں! یہی سمجھ لو" ڈاکٹر طارق نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ عورت اپنے شوہر کو ساتھ لے آئی اس کے شوہر کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ ہیروئن کا عادی ہے اس کے ساتھ ایک پیارا سا بچہ بھی کھڑا تھا۔

علاج شروع ہو گیا تھا اور دو مہینے تک اس عورت کے شوہر کو جس کا نام محمد اشرف تھا ٹھیک ہو جانا تھا ڈاکٹر طارق کی نگرانی میں اس کا علاج ہو رہا تھا جب اشرف صحت یاب ہو گیا تو وہ اور اس کی بیوی ایک مٹھائی کا ڈبہ لائے۔ اشرف کی بیوی نے ڈاکٹر طارق سے کہا "بھائی صاحب آپ کی کوشش سے ان کو صحت حاصل ہوئی ہے آپ کی فیس کے پیسے میں لے کر ساتھ آئی ہوں یہ لے لیجئے۔" یہ کہتے ہوئے اس عورت نے وہ مٹھائی کا ڈبہ

کھولا جس میں مٹھائی کے ساتھ نوٹوں کی گڈیاں تھیں وہ عورت کہہ رہی تھی "بھائی صاحب آپ کے علاج کی فیس دس ہزار روپے بنتی ہے یہ پورے دس ہزار ہیں آپ گن لیجئے۔"

ڈاکٹر طارق نے رقم لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا "بہن آپ نے مجھے بھائی کہا تھا بھلا کوئی بھائی اپنی بہن سے رقم لے سکتا ہے میں جانتا ہوں کہ آپ نے یہ رقم کسی سے قرض لی ہوگی میں نہیں چاہتا کہ آپ مقروض ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے کمپوڈر کی جگہ خالی ہے اگر آپ چاہیں تو اشرف بھائی کو یہاں کام کرنے کے لئے کہہ سکتی ہیں۔

اس عورت نے ڈاکٹر طارق کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "بھائی صاحب میں خود بھی یہی کہنے والی تھی کہ آپ ان کو کہیں نوکری دلوا دیں۔" ڈاکٹر طارق نے کہا کہ آپ انھیں لے کر کل صبح آجایئے گا۔ انشاء اللہ آپ کی ملازمت پکی ہے۔ اس کے بعد وہ عورت چلی گئی۔

ڈاکٹر طارق نے اپنے اسسٹنٹ ڈاکٹر سے کہا "یہ جو میں نے اس غریب عورت کے ساتھ نیکی کی ہے اس کی وجہ ایک کہانی ہے جو میں تمہیں سنا رہا ہوں۔"

"یہ ۱۹۶۷ء کا واقعہ ہے ایک عورت اپنے بچے کے ساتھ کراچی کے ایک قصبے میں رہتی تھی اس بچے کا نام گڈو تھا۔ گڈو کا باپ اس کی پیدائش کے دو سال بعد ہیروئن کا عادی ہو کر مر گیا تھا۔ گڈو کی ماں دن بھر محنت کرتی خود روکھی سوکھی کھالیتی مگر اپنے بچے کا اتنا خیال رکھتی کہ اسے کسی قسم کا احساس کمتری نہ ہو۔ اس نے گڈو کو ایک اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ گڈو بھی بڑا ہوشیار لڑکا تھا وہ اسکول کا کام وقت پر کرتا اور جو کام استاد کرواتے اسے گھر آکر یاد کرلیتا۔ دن گزرتے رہے گڈو میٹرک میں آگیا میٹرک کے امتحان میں اس نے پورے شہر میں اول پوزیشن حاصل کی اس کی ماں خوشی سے پھولے نہیں سمارہی تھی کیونکہ اس کی محنتیں رنگ لائی تھیں۔

گڈو انٹر کے امتحان میں بھی بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا۔ حکومت نے اسے اپنے خرچے پر امریکہ میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا گڈو کی ماں نے اسے بتایا تھا کہ اس کا باپ ہیروئن کا عادی تھا اور اس کے باپ کو کینسر ہو گیا تھا۔ گڈو نے اسی لئے یہ عہد کیا ہوا تھا کہ وہ ڈاکٹر بنے گا اور اپنے ملک میں جا کر ہیروئن کے عادی افراد کا علاج کرے گا۔ جب کوئی شخص

دل میں کوئی نیک کام کرنے کا عہد کر لے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی مدد کرتا ہے گڈو نے بھی نیک کام کا عہد کیا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی مدد کی اور اس نے ڈاکٹری کا امتحان پاس کرلیا۔ وہاں کی حکومت نے اس کی قابلیت دیکھتے ہوئے اسے اپنے ملک میں رکھنا چاہا کسی پاکستانی کے لئے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا مگر گڈو نے طے کیا ہوا تھا کہ وہ اپنے ملک سے ہیروئن کا خاتمہ کرے گا اس لئے وہ یہ اعزاز ٹھکراتے ہوئے اپنے ملک کو روانہ ہو گیا جہاں اس کی شفیق ماں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جب وہ اپنے ملک کی سرزمین پر اترا اس کی ماں کے ساتھ اس کے بہت سے وہ رشتہ دار جنھوں نے اس کی غربت کے دنوں میں اس کے گھر آکر اس کا اور اس کی ماں کا حال بھی پوچھنا گوارہ نہ کیا تھا اس کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔

گڈو نے مختلف ہسپتالوں میں کام کر کے پیسہ جمع کیا اور اپنا ایک خوبصورت اور خاصا بڑا پرائیوٹ ہسپتال کھولا جہاں مختلف بیماریوں کے علاوہ ہیروئن کے عادی افراد کا علاج بھی ہوتا تھا۔ آج اس کی ماں اس کے ساتھ بڑے اعلیٰ بنگلے میں رہتی ہے۔ گڈو ماں کی بہت عزت کرتا ہے اور اپنی ماں کی ایک بات بھی نہیں ٹالتا اور اس کی ماں نے گڈو سے کہا ہوا ہے کہ "بیٹا ہمیشہ غریبوں کی مدد کرنا کیونکہ ہم بھی پہلے غریب ہی تھے اور ہمیشہ اللہ کی خوشنودی کو مدِنظر رکھنا دولت تو آنی جانی چیز ہے۔ آج ہمارے پاس ہے تو کل کسی اور کے پاس۔قبر میں تو انسان اپنے اعمال کے ساتھ جاتا ہے۔ گڈو نے بھی اماں کا کہنا مانا اور غریبوں کی مدد کرنا اپنا مقصد ٹھہرایا۔

"سر اس لڑکے کا پورا اور اصل نام کیا ہے۔" اسسٹنٹ نے جو اب تک بڑی خاموشی سے کہانی سن رہا تھا ڈاکٹر طارق سے پوچھا ڈاکٹر طارق نے کہا "بھائی میں ہی وہ انسان ہوں اور آج بھی مجھے میری والدہ ڈاکٹر طارق نہیں بلکہ گڈو ہی کہتی ہیں کیونکہ میں تو آج بھی ان کے لئے وہی بچہ ہوں۔" ڈاکٹر طارق کہتے چلے گئے۔

اسٹنٹ حیرانی سے ڈاکٹر طارق کو دیکھ رہا تھا جن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

برف کا شہر

مرسلہ: رقیہ آرزو، کوئٹہ

آیئے ہم آپ کو برف کے بنے ہوئے ایک خوبصورت شہر کی سیر کراتے ہیں،

برف، کا یہ شہر مختلف ممالک کے ماہرین طبقات الارض نے قطب شمالی سے آٹھ سو میل دور گرین لینڈ میں تعمیر کیا ہے۔ اسکا نام کیمپ سینچری ہے۔

خیال ہے کہ ہزار ہا فٹ گہری برفانی تہہ کے نیچے کرۂ ارض کے وجود میں آنے کا راز چھپا ہوا ہے۔ اور یہ شہر اسی لئے بنایا گیا ہے۔ تقریباً بارہ سو فٹ لمبے اور نو سو فٹ چوڑے شہر کی عمارتیں سرتا پا برف سے بنائی گئی ہیں اور یہاں ایک سو سائنس دان، انجینئرز اور سپاہی رہائش پذیر ہیں اور انہیں زندگی بسر کرنے کی ہر سہولت میسر ہے۔

برف کے اس شہر کے گھر کا ہر کمرہ ایئر کنڈیشنڈ ہے اور گرمی سردی قطعی اعتدال پر ہوتی ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون حتیٰ کہ روزانہ اخبار بھی یہاں با آسانی مل جاتے ہیں۔

دنیا کا غالباً یہ واحد شہر ہے جس کا انتظام ایٹمی قوت کے ذریعے چل رہا ہے تیز و تند ہوائیں اور برف کے ہولناک طوفان یہاں مسلسل آتے رہتے ہیں۔ ان طوفانوں کی رفتار بعض اوقات ایک سو میل فی گھنٹہ سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ ان حالات میں کسی ذی روح کا زندہ رہنا ناممکن بات ہے مگر اب انسان نے ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔

برف کے شہر سے ۱۵۰ میل دور تھیول کا ہوائی اڈا ہے۔ اس شہر کو پوری دنیا سے ملانے کے لئے انجینئروں نے چٹانوں کی مانند ٹھوس برف کو اندر ہی اندر کاٹ کر ایک سرنگ تیار کی اور پھر سرنگ میں ریل کی پٹڑی بچھا کر اسے ہوائی اڈے سے ملا دیا ہے۔

آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ برف کے شہر میں رہنے والے ہر وقت سردی سے ٹھٹھرتے رہتے ہوں گے، جی نہیں اس کے برعکس وہ تو ہلکے لباس بھی پہنتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکانوں کے درمیانی حصے میں ہر وقت درجہ حرارت ۴۰ سینٹی گریڈ سے لے کر ۶۰ سینٹی گریڈ قائم رہتا ہے۔ ساتھ ہی سرنگوں سے گرم ہوا خارج کرنے کا انتظام بھی ہے تاکہ برف کی دیواریں پگھلنے نہ پائیں ورنہ سارا شہر چند لمحوں میں تباہ ہو جائے گا۔

اس شہر کے رہنے والے سورج دیکھنے سے محروم ہیں۔ کیونکہ انہیں باہر آنے کی اجازت نہیں البتہ شہر کے اندر ہی ایسی تیز روشنی ہوتی ہے کہ بالکل دن کا گمان ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ شام ہوتے ہی روشنی غائب ہو جاتی ہے۔ گویا سورج غروب ہونے کے بعد رات کا اہتمام بھی موجود ہے تاکہ شہر میں رہنے والوں کو دن رات کا احساس ہوتا رہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ برف کا شہر آہستہ آہستہ اپنی جگہ

سے حرکت بھی کرتا ہے اور اس وجہ سے دیواریں اور چھتیں اپنی جگہ سے کھسک جاتی ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ہر دس سال بعد شہر کو نئے سرے سے بنانے کی ضرورت پیش آیا کرے گی۔

برف کا یہ چھوٹا سا شہر جو باقی دنیا سے بالکل الگ تھلگ ایک عجوبے کی حیثیت رکھتا ہے یقیناً تسخیرِ فطرت کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہاں رہنا، کام کرنا اور شدید ترین برفانی طوفانوں میں زندہ رہنا ایک عظیم کارنامہ ہے ممکن ہے مستقبل قریب میں ایسے کئی شہر قطب شمالی اور قطب جنوبی میں بنائے جائیں جو ہم تک زمین سے متعلق بعض گم شدہ کڑیوں کو پہنچانے کا کام کر سکیں۔

کون کب پیدا ہوا

مرسلہ: سید مراد علی شاہ

- ..... قائداعظم محمد علی جناح ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔
- ..... مولانا عبید اللہ سندھی ۱۶ مارچ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے۔
- ..... ایڈیسن ۱۱ فروری ۱۸۴۷ء کو اوھایو میں پیدا ہوئے۔
- ..... مغل بادشاہ اکبر اعظم ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۵ء کو عمر کوٹ میں پیدا ہوئے۔
- ..... سردار عبدالرب نشتر ۱۳ جون ۱۸۹۹ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔
- ..... مغل بادشاہ شاہجہاں ۴ جنوری ۱۵۹۲ء میں پیدا ہوئے۔
- ..... ملکہ نور جہاں ۱۵۸۷ء کو قندھار میں پیدا ہوئیں۔
- ..... فراق گورکھپوری ۲۸ اگست ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔
- ..... مغل بادشاہ نور الدین جہانگیر ۳۰ اگست ۱۵۶۵ء میں پیدا ہوئے۔
- ..... ڈاکٹر ماریہ مونسٹیوری ۳۱ اگست ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئیں۔
- ..... اورول رائٹ ۱۹ اگست ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے۔
- ..... نپولین بونا پارٹ ۱۵ اگست ۱۹۴۹ میں پیدا ہوئے۔
- ..... مولانا ابوالکلام آزاد ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء کو مکہ میں پیدا ہوئے۔
- ..... سلطان صلاح الدین ایوبی ۶ فروری ۱۱۳۸ء میں پیدا ہوئے۔

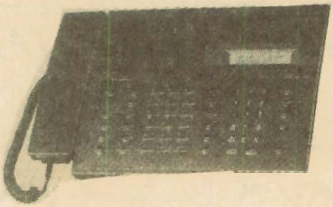

ٹیلی فون

مرسلہ: افشیں عزیز کراچی

آج جب ہم اسکول سے واپس آئے تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا، کچھ آدمی ہاتھوں میں لمبے لمبے تار لئے کھڑے تھے، ہمیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی جب ڈرائنگ روم میں پہنچے تو خوشی سے پاگل ہوگئے سامنے میز پر ہرے رنگ کا ٹیلی فون اپنی شان دکھا رہا تھا، ہم جیسے ہی ٹیلی فون کی طرف بڑھے، امی ڈرائنگ روم میں آگئیں کہنے لگیں "چلو اپنے کمرے میں پہلے کپڑے بدل لو۔" ہم نے یہ سوچا چلو پہلے کپڑے تبدیل کر لیں پھر اپنی سہیلی کو ٹیلی فون کریں گے۔ ہم نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے پھر ڈرائنگ روم کی طرف گئے، جیسے ہی ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا میری چھوٹی بہن ثروت وہاں آگئی "امی بلا رہی ہیں چل کر کھانا کھالو۔" ہم ناچار ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھے جلدی جلدی دو چار لقمے حلق سے اتارے اور پھر ڈرائنگ روم کی طرف دوڑے، جب ڈرائنگ روم میں پہنچے تو دیکھا ابو فون پر کسی سے باتوں میں مصروف ہیں۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو بہت خوش ہوئے کیونکہ ٹیلی فون خالی پڑا تھا، ہم خوشی خوشی ٹیلی فون کی طرف بڑھے، ابھی ریسیور کی طرف ہاتھ ہی بڑھایا تھا کہ بھائی جان ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور کہنے لگے میں تمہیں ہی تلاش کر رہا تھا، میرے کچھ دوست آگئے ہیں یہ پیسے لو اور دوکان سے بسکٹ کے پیکٹ لے آؤ، ہم تیز تیز قدموں سے دوکان کی طرف گئے۔ محلے کی دکان بند تھی ہم دوسری دکان پر گئے جلدی سے بسکٹ کے پیکٹ لیکر گھر پہنچے۔

کچن میں امی چائے بنا رہی تھیں، امی نے کہا جلدی سے پلیٹ میں بسکٹ نکالو میں چائے بنا رہی ہوں۔ ہم نے بڑی بے دلی سے بسکٹ پلیٹ میں نکالے اور چائے لیکر بھائی کے کمرے

کی طرف چل دی۔ جب ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرے تو پتا چلا کہ بھائی اپنے دوستوں کو ڈرائنگ روم میں لے کر بیٹھے ہیں، ہم بڑے پریشان ہوئے خیر چائے وہاں پہنچا کر اپنے کمرے میں واپس آگئے، سوچا اتنی دیر میں ہوم ورک کر لیں، پھر یہ سوچ کر الماری میں سے اسکول کا بیگ نکالا اور ہوم ورک میں مصروف ہوگئے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا لکھیں۔ ہمارے ذہن پر تو ٹیلی فون سوار تھا، کاپیاں کتابیں واپس بیگ میں رکھیں اور بیگ الماری میں رکھ دیا اور ایک دلچسپ ناول نکال لائے۔ پڑھنے لگے لیکن کچھ مزا نہیں آیا ناول واپس رکھا اور دیکھنے چلے کہ بھائی کے دوست چلے گئے یا نہیں وہاں پہنچے تو بھائی کے دوست جاچکے تھے۔ فوراً ٹیلی فون کے پاس پہنچے اتنے میں باجی آگئیں اور بولیں مجھے اپنی دوست کو فون کرنا ہے ہم وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے تقریباً آدھے گھنٹے بعد باجی نے فون چھوڑا پھر جیسے ہی ہم فون کی طرف بڑھے بھائی کی غصیلی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی "جب دیکھو فون کے ساتھ چمٹی رہتی ہو اور کوئی کام ہے تمہارے پاس"۔ اور ایک بار پھر ہم ناکام اپنے کمرے میں واپس آگئے۔

میرے دیس کا مزدور

مسز ایم مسعود ذکی، کراچی

اس کے ماتھے پر قطرے پسینے کے ہیں
اس کے ہاتھوں میں تیشہ ہے فرہاد کا
اس کے ہونٹوں پر نغمے بہاروں کے ہیں
منتظر یہ نہیں ہے کسی داد کا
آگے اس کے نہ منزل کوئی دور ہے
یہ میرے دیس کا ایک مزدور ہے

طوے خاطر میں ہرگز نہ کوہ و دمن
اس نے سینچا ہے اپنے لہو سے چمن
اس کی سُرخیٔ خوں لالہ و گل میں ہے
اس کے چہرے پر الجھن نہ فکر و تھکن
کام کے نشے میں یہ بہت چور ہے
یہ میرے دیس کا ایک مزدور ہے

کمسن مجاہد

یوسف سندھی میمن
ترجمہ: عبدالحمید

مرشی اور لوشی دونوں بھائی بہن ویتنام کے ایک چھوٹے قصبے کے کنارے ایک موٹے درخت میں چھپے بیٹھے تھے۔ ان کے والد کو کل جنگ میں گولی لگی تھی اور وہ زخمی حالت میں گھر پر موجود تھا۔ اس کی بندوق بھی وہیں پڑی تھی۔ انھوں نے چوری چھپے وہ بندوق اٹھائی اور درخت پر ایک دوسرے کی مدد سے چڑھ کر اس جگہ چھپ گئے کہ اگر دشمن پھر حملہ کرے تو انہیں جواب دیا جائے۔

یہ دوپہر کا وقت تھا تھوڑی دیر بعد اچانک امریکی سپاہی پھر گاؤں پر حملہ آور ہوئے۔ گاؤں کے چاروں طرف خندقوں میں قصبے کے مرد اور عورتیں پہلے ہی دشمن سے مقابلے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ بڑی زبردست قسم کی جنگ شروع ہو گئی۔ لوشی اور مرشی بھی درخت پر بندوق ہاتھ میں پکڑ کر چوکس ہو کر بیٹھ گئے ان کے دونوں اطراف میں گولیاں چل رہی تھیں۔ اچانک ایک طرف سے دو امریکی سپاہی کچھ ہی فاصلے پر جنگل میں نظر آئے۔ دونوں ہی سپاہی خندق میں لیٹے قصبے پر فائرنگ کر رہے تھے۔ مرشی اور لوشی زمین سے دس فٹ بلند تھے اس لئے انہیں یہ سپاہی بہ آسانی نظر آ گئے اور پورے ٹارگٹ پر تھے۔ "بندوق مجھے دو میں چلاتی ہوں" مرشی بولی۔ "نہیں، نہیں تم لڑکی ہو تم سے بندوق نہیں چلے گی۔ میں خود چلاتا ہوں۔" لوشی نے بندوق ہاتھ میں اٹھائی مگر وہ بھاری تھی اور اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ آخر ایک ترکیب ذہن میں آ گئی۔ مرشی بندوق کی نالی کے نیچے بیٹھ گئی اور نالی کو اپنے کندھوں پر رکھ لیا اور لوشی نے اس کے پیچھے سے سپاہیوں پر نشست باندھ کر جلدی سے اس نے آٹھ راؤنڈ چلا دیئے۔ جہاں سپاہی لیٹے

ہوئے تھے وہاں گرد و غبار اڑا پھر معلوم نہ ہو سکا کہ ان کا کیا ہوا۔

شام تک جنگ چلتی رہی اس کے بعد امریکی سپاہی لاریاں لے کر واپس ہو لئے۔ قصبے میں جنگ بند ہونے کا نقارہ بجا اور سارے قصبے والے خندقوں سے نکل کر باہر آگئے۔ یہ دونوں کمسن سپاہی بھی درخت سے اتر آئے اور بندوق اٹھائے دوڑتے ہوئے اس طرف گئے جہاں انھوں نے سپاہیوں پر گولیاں چلائی تھیں۔ وہاں تازے خون کی دو نہریں بنی ہوئی تھیں۔ انھوں نے اس مٹی سے چُلّو بھرے اور دوڑتے ہوئے گاؤں والوں کے پاس آئے۔ "ویتنام سردار جئے" کے نعرے مارتے جوش سے چلاتے ہوئے آرہے تھے پاس آکر انہوں نے سب کو بتایا کہ "ہم نے ایک کالے اور ایک سفید امریکی کتے کو مار دیا ہے۔" قصبے والے انہیں کندھوں پر اٹھا کر ناچنے لگے۔

پیارے بچو!

جب بھی ہمارے پیارے وطن پر کوئی مشکل وقت آئے تو کمزور مت بننا۔ ویت نام کے ان "کمسن مجاہدوں" کی طرح دشمن پر شیر بن کر حملہ کرنا اور جان قربان کرنے سے بھی نہ چوکنا۔

دروازے پر نظر

مرسلہ: ولی محمد، کراچی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ملا نصیر الدین ابھی بچے تھے ان کی والدہ نے سوچا۔ میلے کپڑوں کا ڈھیر لگ گیا ہے دھوبی خدا جانے کب آئے کیوں نہ دریا پر جاکر خود ہی دھو لاؤں مگر پھر گھر کا کیا بنے گا؟ اکیلے گھر کو کس پر چھوڑوں؟ انھیں نصیر الدین کا خیال آیا اسے جو کام سونپا جائے کر ہی لیتا ہے گھر کی حفاظت بھی اس ہی کے ذمے کر دوں۔ انھوں نے نصیر الدین کو آواز دی اور ان سے کہا دیکھو نصیر الدین میں کپڑے دھونے ندی پر جا رہی ہوں۔ ایک گھنٹے سے پہلے نہ آسکوں گی گھر اکیلا ہے تم دروازے پر نظر رکھنا۔ نصیر الدین راضی ہوگئے اور ان کی والدہ کپڑوں کی گٹھڑی لے کر دریا پر چل دیں۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ نصیر الدین اپنا فرض ادا کرتے رہے۔ دوسرا گھنٹہ بیت گیا اب ان کی اکتاہٹ بڑھ گئی اماں ابھی تک نہیں آئیں، خدا جانے کیا بات ہے مجھے دریا پر جاکر دیکھنا چاہئے مگر وہ تو مجھے دروازے پر نظر رکھنے کو کہہ گئی ہیں۔ اگر میں چلا جاتا ہوں تو پھر، اور آخر کار انہیں ایک ترکیب سمجھ میں آگئی۔ انھوں نے دروازے کا پٹ چوکھٹ سے نکالا اور اسے کمر

پر لاد کر کھاٹ کی سمت روانہ ہوگئے۔ جیسے ہی وہ گھاٹ پر پہنچے اور والدہ کی نظر ان پر پڑی انھوں نے پوچھا۔ نصیرالدین تم یہاں کیا کر رہے ہو میں نے تو تمھیں دروازے پر نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ جی ہاں اماں گھبرائیے نہیں میں دروازے کو بھی اپنے ساتھ لایا ہوں۔ نصیرالدین نے جواب دیا۔

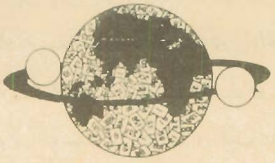

معلوماتِ عالم

(۱)..... دنیا کا سب سے بڑا عجائب گھر نیویارک امریکہ میں ہے۔

(۲)..... دنیا کی سب سے پہلی لوہے کی توپ انگلستان میں ۱۵۰۹ میں بنی تھی۔

(۳)..... دنیا میں سب سے زیادہ یونی ورسٹیاں امریکہ میں ہیں۔

(۴)..... ایک اندازے کے مطابق دنیا میں ۳۰۶۴ زبانیں بولی جاتی ہیں۔

(۵)..... جسم میں خون کی رفتار سات میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

(۶)..... فلوئنٹین پین امریکہ کے باشندے واٹرمین نے ۱۸۸۲ میں ایجاد کیا تھا۔

(۷)..... آواز کی رفتار گیارہ سو فٹ فی سیکنڈ ہوتی ہے۔

(۸)..... کرکٹ کا کھیل اہل مصر نے ایجاد کیا۔

(۹)..... ۱۷۵۵ میں جانسن نے انگریزی کی پہلی ڈکشنری مرتب کی تھی۔

(۱۰)..... سونا سب سے زیادہ جنوبی امریکہ میں پایا جاتا ہے۔

(۱۱)..... ایک تندرست آدمی کا دل ایک منٹ میں ۷۲ مرتبہ دھڑکتا ہے لیکن نپولین بوناپارٹ کا دل ایک منٹ میں صرف چالیس مرتبہ دھڑکتا تھا۔

(۱۲)..... اسرائیل کو سب سے پہلے روس نے تسلیم کیا تھا۔

(۱۳)..... دنیا کا سب سے پہلا اخبار پیکنگ گزٹ تھا۔

(۱۴)..... حضرت خالد بن ولیدؓ ایسے سپہ سالار تھے جنھوں نے جنگ میں کبھی شکست نہیں کھائی۔

(۱۵)..... انسان کے جسم میں کل ۲۰۶ ہڈیاں ہوتی ہیں۔

(۱۶)..... رقبے کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک سوڈان ہے۔

روشن مثال

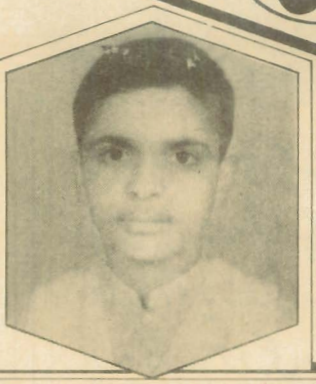

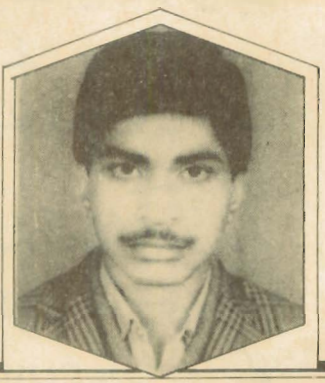

نام : فرحان شاہد ۱۳ سال دہم
مشاغل: کتابیں پڑھنا، ٹکٹ وسکے جمع کرنا
پسندیدہ مضمون: فزکس ، اہم کامیابی: مقابلۂ تقریر میں اوّل
پتہ : ۳ ڈی ۲۸/۲۶ ناظم آباد کراچی

نام: محمد ضمیر مرزا ۱۵ سال گیارہویں
مشاغل : باغبانی، مطالعہ، آنکھ مچولی پڑھنا
مضمون: فزکس، اہم کامیابی: میٹرک میں اے گریڈ
محمد بشیر مرزا بلاک انسپکٹر کنسٹرکشن مکان نمبر ایم ۸۲ وزیر آباد

نام: محمد جاوید ریاض ۱۶ سال گیارہویں
مشاغل: قلمی دوستی، مطالعہ، سیاحت اور شاعری کرنا
مضمون: انگلش، فزکس، اہم کامیابی: میٹرک بورڈ میں تیسری پوزیشن، پتہ: ڈاکخانہ و بمقام دھنڈر کلاں تحصیل بھمبر ضلع میرپور

نام: نورین زہرہ علی ۱۳ سال ساتویں
مشاغل: تصویریں جمع کرنا، مضمون : انگریزی
اہم کامیابی: کھیلوں میں متعدد انعامات
پتہ : شفقت علی بٹ، کرشن نگر

ساتھی بچپن کے

بچپن کی دوستی پختہ بھی ہوتی ہے اور پائیدار بھی۔ بچپن ہی سے اگر اچھے اور ہم خیال دوست میسّر آجائیں تو یہ زندگی کے بہترین ساتھی ثابت ہوتے ہیں۔ آپ خود بھی دوسروں کے اچھے دوست بنیے اور دوسرے اچھے بچّوں کو بھی اپنا دوست بنائیے۔

آنکھ مچولی آئندہ ماہ سے "روشن مثال" کی جگہ نیا سلسلۂ دوستی شروع کر رہا ہے جس کا عنوان ہے

"ساتھی بچپن کے"

آپ اگر قلمی دوستی کے اس سلسلے میں شریک ہونا چاہیں تو اس شمارے کے آخری صفحات پر موجود کوپن پُر کر کے مع پاسپورٹ سائز تصویر بھجوا دیں۔

کوپن کے ساتھ ایک سطر میں "دوستی کا مفہوم" ضرور لکھیں۔ یعنی آپ کے خیال میں دوستی کے معنی کیا ہیں۔

"کوئیز کہانی" میں شرکت کا کوپن (یہ کوپن آئندہ ماہ سے کارآمد ہوگا)

نام _____ کلاس _____

عمر _____ اسکول _____

پتہ _____

_____

اپنے جوابات سادے کاغذ پر لکھئے اور یہ کوپن جواب کے ساتھ منسلک کیجئے۔ بغیر کوپن کے جواب قابلِ قبول نہ ہوگا۔

قلمی دوستی کے سلسلے "ساتھی بچپن کے" میں شرکت کا کوپن

نام _____ عمر _____

کلاس _____ پسندیدہ مضمون _____

مستقبل کا خواب _____

اسکول _____

گھر کا پتہ _____

تصویر اس سائز میں ہو۔

آپ کے نزدیک "دوستی" کا مفہوم کیا ہے۔ (ایک سطر میں) _____

تحریر بھجوانے کے لیے یہ کوپن اپنی تحریر کے ساتھ منسلک کرکے بھجوائیے

نام _____ عمر _____ تعلیم _____

کس طرح کی تحریریں لکھنا پسند کرتے ہیں۔ (مزاح / سنجیدہ / تراجم / کہانی / ایڈونچر یا کچھ اور _____

مکمل پتہ معہ فون نمبر _____

برائے استعمال دفتر آنکھ مچولی :

I۔ ناقابلِ اشاعت II۔ قابلِ اصلاح III۔ قابلِ اشاعت

کُل صفحات جوابی لفافہ ہمراہ ( ) تاریخ جواب ( )

امّی ابّو کا صفحہ

ہما سلیم

بچے کو اس کی کسی غلطی پر "جسمانی سرزنش" کی سزا دینا، انتہائی نا مناسب رویہ ہے آپ کے اس عمل سے غیر محسوس طور پر بچہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سیکھتا کہ،

○ ..... غصے کی حالت میں، کسی ناگوار بات پر بہتر انداز سے سوچنا ترک کر کے سامنے والے کو لتاڑ کر رکھ دو۔

○ ..... کمزور لوگوں پر یا اپنے سے چھوٹوں پر ہاتھ اٹھانا بالکل مناسب اور جائز عمل ہے۔

○ ..... مجھے سزا دینے والا میرا محسن نہیں ہو سکتا یا وہ مجھے دل سے نہیں چاہتا۔

○ ..... ذرا ذرا سی بات پر بچے کو مار پیٹ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ آپ بچے کی اصلاح کے لئے بہتر حل ڈھونڈنے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہیں۔

پرنس بسکٹ کی پیشکش
آپ کے لئے
فائٹر جیٹ
البم اور کیلنڈر
مُفت
Prince
FIGHTER JET
اِسکیم
بہت سے دلکش انعامات جیتئے
اسکیم کے قواعد:
پرنس فائٹر جیٹ اسکیم میں ۸ مختلف اسٹیکرز شامل ہیں۔ پرنس بسکٹ کے فیملی سائز کے ہر پیک میں ایک اسٹیکر بہ ترتیب رکھا گیا ہے۔
پیک کے ایک فلیپ (اوپری حصے) پر پرنس فائٹر جیٹ اسکیم کا خصوصی نشان موجود ہے۔
کوئی سے ایسے ۵ فلیپ (اوپری حصے) جن پر پرنس فائٹر جیٹ اسکیم کا خصوصی نشان ہو جمع کر کے درج ذیل کو بذریعہ ڈاک ارسال کیجئے۔
پرنس فائٹر جیٹ اسکیم کوآرڈینیٹر، کانٹی نینٹل بسکٹس لمیٹڈ
میزانائن فلور۔ پی آئی ڈی سی ہاؤس۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ۔ کراچی۔
یہ اسکیم "پہلے آیئے پہلے پایئے" کی بنیاد پر ہے۔
The French Biscuit Classics
LU

دنیا بھر میں آزمودہ
نیا
FRESHMINT
+ FLUORIDE
macleans
MACLEANS CONTAINS A UNIQUE COMBINATION OF INGREDIENTS TO FIGHT DECAY AND PLAQUE, THE CAUSE OF GUM DISEASE.
Brushing regularly with Macleans helps give you and your family unbeatable protection for teeth and gums.
UNIQUE FORMULA for healthy teeth AND GUMS
پلاک دور
PLAQUE FIGHTING
PA1
سے پلاک دور!
پلاک کیا ہے؟
پلاک جراثیم کی چکنی تہہ ہے جو دانتوں کی سطح پر جم جاتی ہے۔ اگر اس کو دور نہ کریں تو اس کی وجہ سے دانتوں کو کیڑا لگتا ہے۔ پلاک مسوڑوں کی بیماری کا سبب ہے جس سے دانت گرتے ہیں۔
نیا میکلینز۔ پلاک سے حفاظت کے لئے دنیا بھر میں آزمودہ۔
میکلینز نے مسوڑوں کی صحت کے لئے اپنے فلورائیڈ ٹوتھ پیسٹ کے نئے منفرد فارمولے میں PA1 کا اضافہ کیا ہے۔ یہ خصوصی جراثیم کش جزو کلینیکل تجربات میں پلاک سے بچاؤ کے لئے آزمایا ہوا ہے، اور فلورائیڈ کیڑے سے حفاظت کے لئے موثر ہے۔
MILDMINT
macleans
FRESHMINT
macleans
FIGHTS DECAY • FIGHTS PLAQUE
پلاک دور۔
دانت مضبوط

ASIATIC

SUPER CRISP
سُپر ذائقہ سُپر مزہ ...
سُپر دال، سُپر پی نٹس اور سُپر نمکو کے ساتھ
ہے نام مزے کی بات!
اب
25 گرام کے
مِنی پیک
میں بھی!
ٹرپل ایم (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ہیڈ آفس: 72 سی 1 گلبرگ III لاہور پاکستان
فون نمبر: 876396-871672
تار: میگنولیا-ٹیلیکس 44925 ملک پی کے
فیکس: 042-870965
PEANUTS
DAL MOONS
SUPER CRISP
NIMKOMIX
HUNTER
SALT & VINEGAR
PAPRIKA
DILL
SALT & PEPPER
PLAIN SALTED
tripple-em
SUPER CRISP
Natural Potato Chips

Montgomery
tea time
tea time
Montgomery
Montgomery
Montgomery
The Height of Delight!

Orient

کرسٹل ٹوتھ پیسٹ

سے آپ کو زیادہ فائدہ

سنگل برش پیک کی قیمت
میں ڈبل برش پیک

برش بھی ڈبل بچت بھی ڈبل

کرسٹل ٹوتھ پیسٹ کے ڈبل برش پیک کی قیمت دوسرے برانڈ کے سنگل برش پیک سے بھی کم ہے! یعنی پندرہ روپے سے بھی زیادہ کی یقینی بچت۔ اتنی زبردست بچت کے ساتھ ایک کارآمد تحفہ یعنی اینٹی پلاک ٹوتھ برش بھی حاصل کریں اور ساتھ میں ریگولر ٹوتھ برش بھی۔ اس طرح بچت بھی زبردست اور دانتوں کی حفاظت بھی زبردست۔

REGD. No. M-266

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

NOVEMBER 1991

کیچپ تو صِرف

احمد

ٹماٹو کیچپ